فکر و نظر

# دنیا میں بہشت

بعض تجزیہ کاروں کی رائے یہ ہے کہ پاکستان جواس وقت جہنم زار بنا ہوا ہے اور معاشرہ بندگلی اور سول وار کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس کا بنیادی سبب تیسرا ہاتھ ہے۔ یہ تیسرا ہاتھ امریکہ و یورپ کا ہے جو اپنے حمایتیوں (اسرائیل، بھارت، افغانستان) کی مدد سے اپنی اسلام اور مسلم دشمنی کی بناء پر پاکستان کے خلاف سازشیں کر رہا ہے تا کہ پاکستانیوں کو باہم لڑا دیا جائے، پاکستان کو کمزور کیا جا سکے، اسے توڑا جا سکے، اس کی ایٹمی حیثیت ختم کر دی جائے اور اس کی اسلامی و نظریاتی حیثیت تباہ کر دی جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ جن منصوبوں پر کام کر رہا ہے اس کے اہم اجزاء یہ ہیں:

۱- اس نے پاکستانی حکومت اور فوج پر دباؤ ڈال کر انہیں افغانستان پر اپنے حملے کی حمایت پر مجبور کیا، ان سے قبائلیوں کے خلاف آپریشن کرایا اور ان سے لڑایا۔ پاکستانی حکومتوں کے ملک میں اسلامی نظام حیات نافذ نہ کرنے میں بھی امریکی یورپی دباؤ کا ہاتھ ہے۔

۲- اس نے قبائلیوں کو پاکستانی حکومت اور فوج کے خلاف لڑنے میں مدد دی، وہاں مداخلت کار بھیجے، انہیں منظم کیا، اسلحہ اور ڈالر دیے تا کہ وہ پاکستانی حکومت، فوج اور معاشرے کو نقصان پہنچائیں۔ اس نے خود بھی قبائل پر ڈرون حملے کیے اور پاکستانی فوج سے بھی کرائے تا کہ وہ مشتعل ہوں اور غصے اور انتقام میں پاکستان پر پل پڑیں۔

۳- اس نے پاکستانی علماء اور دینی عناصر میں فرقہ واریت کے بیج بوئے اور بیرونی و مقامی ایجنسیوں اور حکومت کی مدد سے ان میں مسلکی تعصّبات کو ہوا دی اور انہیں باہم لڑایا تا کہ وہ متحد ہو کر دینی مفادات کے لیے موثر قوت نہ بن سکیں اور سیکولر سیاسی جماعتوں کے مقابلے کی قوت نہ بن سکیں۔

۴- اس نے پرامن ذرائع اختیار کرتے ہوئے پاکستان کو اس کے بنیادی نظریے سے ہٹانے اور اسے سیاسی، معاشی و سماجی لحاظ سے کمزور کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے جو اب بھی جاری ہیں مثلاً سیاسی عدم استحکام کے لیے فوج کو اقتدار کے چسکے کی راہ پر ڈالنا، اپنی مرضی کی حکومتیں بنوانا، سیکولر جماعتوں کو اور اسی طرح دینی جماعتوں کو باہم لڑانا، مشرقی پاکستان کو الگ کرانا، بلوچستان اور کراچی میں شورش برپا کرانا......وغیرہ معاشی بہتری کے لیے قرضوں کی معیشت کو پروان چڑھانا، فنڈز ضائع کرانا، کرپشن کو پروموٹ کرنا، خزانہ اور تجارت کی وزارت پر اپنے آدمی لگوانا، بڑے ڈیم نہ بننے دینا، سودی نظام کو ختم نہ ہونے دینا......وغیرہ دینی و اخلاقی تباہی کے لیے نظام تعلیم کو اسلامی بنیادوں سے ہٹانا، تعلیم کو مرکز کی بجائے صوبوں کے سپرد کرنا، انگریزی زبان کو غلبہ دلانا۔ فحاشی و عریانی، اسلامی اور اخلاقی قدروں کی پامالی اور سیاسی ابتری کے لیے میڈیا کو خرید لینا، مغرب زدہ NGOs کا جال پھیلانا، فیملی پلاننگ اور مخلوط تعلیم کو رواج دینا......وغیرہ

سوال یہ نہیں کہ امریکہ، یورپ اور بھارت یہ کیوں کر رہے ہیں؟ وہ تو دشمن ہیں اور دشمنوں سے دشمنی کی ہی توقع رکھنی چاہیے سوال یہ ہے کہ ہم کیوں اپنے دشمن بنے ہوئے ہیں؟ ہم کیوں دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں؟ ہم کیوں اپنا نفع نقصان نہیں سوچتے؟ ہم دوسروں کو الزام کیوں دیتے ہیں؟ ہم اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے؟ ہم اپنا احتساب کیوں نہیں کرتے؟

اگر ہم اپنے کرتوتوں سے باز آجائیں۔ پاکستانی حکومت اور فوج امریکہ کی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' (جو درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے) سے باہر نکل آئے اور ملک میں نفاذ شریعت کا اعلان کر دے (کہ پاکستان کی ۹۷ فیصد آبادی مسلمان ہے اور شریعت کا نفاذ چاہتی ہے) اگر قبائلی حکومت کے خلاف لڑنے سے باز آجائیں، اگر علماء اور دینی عناصر فرقہ وارانہ تعصّبات سے کنارہ کشی کر لیں اور باہم شیر و شکر ہو جائیں اور یہ سب لوگ اپنے اپنے امور میں امریکی ڈکٹیشن اور ترغیبات قبول کرنے سے انکار کر دیں تو پاکستان کا قبلہ درست ہو جائے گا، اس کے مسائل حل ہونا شروع ہو جائیں گے اور وہ وقت ان شاء اللہ دور نہیں ہوگا جب پاکستان اس دنیا ہی میں جنت نظیر بن جائے گا اور لوگ سکھ چین اور امن وسکون کی زندگی گزاریں گے۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ ہم امریکہ ویورپ کی غلامی سے جان کیوں نہیں چھڑا سکتے؟ ہم ان کی سازشوں کا منہ توڑ جواب کیوں نہیں دے سکتے؟ ہماری مغرب سے مرعوبیت کب ختم ہوگی؟ ہم اپنے دین سے کیوں نہیں جڑتے؟ اپنے نظام حیات سے وفادار کیوں نہیں ہوجاتے؟ ہم اپنے آپ پر اعتماد کیوں نہیں کرتے؟

## تین ماہ سے جاری ورکشاپ کے نتیجے میں تحریک اصلاح تعلیم کے

# تین اہم فیصلے

**۱**- ایک نیا رول ماڈل اقامتی تعلیمی ادارہ، کسی بھی سطح سے، شروع کر دیا جائے (ایک نان کمرشل فلاحی اسلامی قومی منصوبہ) **۲**- اسلامی نصابی کتب کی تیاری اور تربیت اساتذہ کا کام شروع کیا جائے (اسلامی سکولوں کے ساتھ سرمایہ کاری کی بنیاد پر) **۳**- 'ایجوکیشن واچ' کے نام سے ایک گروپ/ فورم تشکیل دیا جائے تاکہ تعلیم کی بگڑتی ہوئی صورت حال حکمرانوں اور قوم کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کے سامنے رکھی جاسکے۔

**اسلامی نصابی کتب کی تیاری اور تربیت اساتذہ کے اہم منصوبے میں سرمایہ کاری کی دعوت**

اس ماہ کے البرہان کے آخری صفحات میں **'سکول متوجہ ہوں'** کے عنوان سے پیش خدمت ہے۔

باقی منصوبے بھی ایک ایک کر کے پیش کیے جائیں گے، ان شاء اللہ۔

شذرات

مدیر

# علماء کرام اور پاکستان کی دینی قوتیں

## مٹ جاؤ گے تو اتحاد کا سوچو گے؟

دین اور وطن دشمنوں نے پشاور کا سانحہ کرایا تو ان کی پلاننگ کے عین مطابق جذبات کا ریلا عوام و خواص کو بہالے گیا اور عسکری اور سیاسی قیادت نے اور میڈیا اور سیکولر دانشورں نے آپ کو دیوار سے لگا دیا یہاں تک کہ آج آپ اپنا موقف بھی کھل کر بیان نہیں کر سکتے۔ مدارس کی پکڑ دھکڑ جاری ہے اور انتہا پسندی اور سہولت کاری کا نام لے کر دینی عناصر کا شکنجہ کٹنے کی منصوبہ بندیاں ہورہی ہیں لیکن اس کے باوجود آپ متحد ہونے کو تیار نہیں۔ سیاسی مشاورتی اجلاسوں میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا رخ کہیں اور ہوتا تھا اور سراج الحق صاحب کا کہیں اور۔ اگر دشمن نے اس طرح کے ایک دو سانحے اور کرا دیے جو وہ با آسانی کرا سکتا ہے تو آپ کے مدرسے بند کرا دیے جائیں گے اور بعید نہیں کہ مسجدوں پر حملے بھی شروع ہوجائیں تو کیا اس وقت اتحاد کا سوچو گے؟ یہ اقتدار اور کرسی، اور مرکز یا صوبے میں چند وزارتیں اور اپنے اپنے مسلک اور فرقے کا تعصب- خدا کے بندو! کب نفس اور شیطان کے اس جال سے نکلو گے؟ جب ملک میں سیکولرازم نافذ ہو جائے گا؟

ہم علماء کرام سے اللہ کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ سیاسی سطح پر بھی دین کو بچانے اور اس کے تحفظ کے ایک نکتے پر متحد ہو جائیں اور غیر سیاسی سطح پر عوام کی دینی تعلیم و تربیت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے بھی یکجا ہو جائیں کہ ریاست اسلامی نہیں ہوسکتی تو معاشرے کو ہی بچا لو، افراد کو ہی دین سے دور نہ ہونے دو۔ یہ ملک ہم نے بڑی قربانیوں سے اسلام کے نام پر اللہ سے مانگ کر لیا تھا۔ اگر یہ سیکولر ہوگیا یا میں بے دینی پھیل گئی تو اے علماء کرام اور اے علمبرداران اسلام! کل اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گئے؟

پچھلے دنوں علمائے دیوبند نے آپس کے تفرقے مٹانے کے لیے اپنے بڑے، ثقہ اور معتدل مزاج علماء کرام پر مشتمل ایک 'سپریم کونسل' تشکیل دی تھی۔ ہم تجویز کرتے ہیں کہ علمائے بریلی، اہل حدیث اور دیگر مسالک بھی اپنی اپنی ایک سپریم کونسل بنالیں اور اپنے اپنے مسلک کے اندر اتحاد و یکجہتی اختیار کریں اور اپنی ایک قیادت منتخب کرلیں۔ پھر اس طرح کی سپریم کونسلیں باہم مل جائیں تو سارے مسالک کے علماء کرام کی ایک گرینڈ سپریم کونسل وجود میں آجائے گی جو پاکستان کے سارے دینی مکاتب فکر کی نمائندہ ہوگی اور دینی قوتوں اور مسلمانان پاکستان کی منتخبہ کونسل ہوگی جو اہم فیصلے کر سکے گی اور جسے سارے مسالک اور مکاتب فکر تسلیم کریں گے۔

ربیع الاوّل مدیر

# سانحہ پیرس......امت......اور مغرب

## توہین رسالت......ایک عالم گیر مسئلہ بن گیا

## مسلمان حکمران حمیت کا ثبوت کیوں نہیں دیتے؟

پیرس کے ایک جریدے نے پیغمبرﷺ کے کارٹون چھاپے، اس توہین رسالت پر بعض جذباتی مسلمانوں نے جریدے کے دفتر پر حملہ کر کے ۱۲ آدمی ہلاک اور بہت سے زخمی کر دیے۔ اس پر مغرب میں کہرام مچ گیا (اور مچنا چاہیے تھا......دنیا ہماری طرح بے حس اور بے غیرت تھوڑی ہے کہ امریکہ نے عراق و افغانستان میں لاکھوں مسلمان مار دیے اور کوئی اسے پوچھنے والا نہیں۔ خود پاکستان میں ۵۵ ہزار افراد مار دیے گئے اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ کس نے مروائے اور کس نے مارے؟ اس خون خاک نشیناں کا ذمہ دار کون ہے؟ اور قاتل کہاں ہیں؟ یورپ و امریکہ سے چالیس سربراہان مملکت جمع ہو گئے اور اہل پیرس سے ہمدردی کی اور مسلمان دہشت گردوں کی سخت ترین مذمت کی۔

دنیا میں ۵۷ مسلم ممالک ہیں۔ پونے دو ارب کی آبادی، لاکھوں کی فوج، سٹرٹیجک پوزیشن کا محل وقوع، تیل، پٹ سن، ربر میں اجارہ داری......لیکن کسی ایک مسلم مملکت کے حکمران کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ بولے۔ اس دہشت گردی کی مذمت کرے اور ادب سے پوچھے 'ذرا یہ تو بتایئے کہ ان جنونیوں نے حملہ کیوں کیا تھا؟' آپ کا حق آزادیٔ اظہار سر آنکھوں پر لیکن پونے دو ارب مسلمانوں کے محبوب رہنما کا تمسخر اڑانا کیوں ضروری ہے؟ اگر ۵۷ مسلم ممالک کے سربراہ اکٹھے ہو کر اقوام متحدہ کی عمارت کے باہر احتجاج کریں اور یورپ و امریکہ اور اقوام متحدہ سے یہ سوال پوچھیں تو دنیا کو سوچنا پڑے گا! لیکن اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ۵۷ ممالک کے سربراہ اکٹھے کیوں کر ہوں۔ اہل مغرب بڑے سمجھ دار اور ہوشیار ہیں۔ انہوں نے اس کا انتظام پہلے سے کر رکھا ہے۔ سعودی عرب کے ذریعے اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC) کو گہری نیند کے انجکشن دے کر سلا دیا گیا ہے اور مسلمان حکمرانوں کی اکثریت امریکہ کی غلام ہے یا کم از کم مغرب کی ذہنی غلام ضرور ہے۔ ایسے میں عالم اسلام حرکت میں کیوں کر آئے؟

آہ! آج ہماری بے دینی، بے عملی، بے حسی اور بے حمیتی نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ پونے دو ارب مسلمانوں کے محبوب پیغمبر کا تمسخر اڑایا جاتا ہے اور کوئی بولتا نہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں اور جو بولے وہ دہشت گرد ٹھہرے۔

ربیع الاوّل

# اے اللہ کے رسول ﷺ ہم شرمندہ ہیں

وہ تو پندرہ لاکھ کی تعداد میں جمع ہوئے اور اُن کے چالیس سربراہانِ مملکت اُن کی قیادت کررہے تھے جن میں شاید مصلحتاً ہمارے دو تین بھی شامل تھے اور وہ سب مل کر پوری یک جہتی کے ساتھ اس بات پر احتجاج کررہے تھے کہ آپ ﷺ کے گستاخانہ خاکے چھاپنے والوں پر احتجاجی حملہ کیوں کیا گیا۔ ہم یہاں پاکستان میں ملین مارچوں کے دعوے کرتے رہتے ہیں جن میں لوگوں کی تعداد ملین کے دسویں حصے کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے ملین مارچ کا دعویٰ کیا لیکن اُن کی کال پر ڈیڑھ ملین لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ہم نے یہاں گستاخانہ خاکوں پر احتجاج کرتے ہوئے اپنی اپنی جماعتوں کے جھنڈے اُٹھا کر یہ جلوسیاں اور ریلڑیاں نکالیں۔ ہم اس نازک موقع پر بھی اسلام کے نام پر اور ناموسِ رسول ﷺ کے نام پر اکٹھے نہ ہو سکے۔ کفر والوں نے **الکفر ملة واحدہ** کا سماں دکھادیا لیکن ہم عشق رسول ﷺ کے دعوے دار مسلمانوں کے ملتِ واحدہ ہونے کا منظر نہ دکھا سکے۔

اے اہل سنت والجماعت والو، اے سُنی اتحاد کونسل والو، اے جماعت الدعوہ والو، اے وحدت المسلمین والو، اے جماعتِ اسلامی والو، اے جمعیتِ علمائے اسلام اور پاکستان والو، اے دیوبندیو، اے بریلویو، اے ناموسِ رسالت پر کٹ مرنے کے دعوے کرنے والو! آپ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ رسول اللہ ﷺ کی عزت و ناموس پر اکٹھے ہو کر اسلام اور پاکستان کا جھنڈا اُٹھا کر ہم زبان اور ہم قدم ہو کر ملین مارچ کر کے دکھاتے تاکہ ان کو بھی ہمارے غم وغصہ کی آنچ محسوس ہوتی۔

اے اللہ کے رسول ﷺ ہم شرمندہ ہیں کہ آپ کی شانِ اقدس کے خلاف دشمن کے گستاخانہ عزائم اور کھلے اقدامات بھی ہمیں اکٹھا نہ کر سکے۔ ہم پاکستان کے مسلمان کتنے بدبخت ہو چکے ہیں۔

یا اللہ ہم پر رحم فرما اور ہمارے رہنماؤں کو ہدایت عطا فرما (آمین)

شرمندگی میں سرتاپا ڈوبا ہوا اللہ کا حقیر بندہ

(پروفیسر ملک محمد حسین)

ربیع الاوّل

پروفیسر ملک محمد حسین

# رسول کریم ﷺ کی یاد کیسے منائی جائے؟
# ذرا سوچیئے

یہ دسمبر 1973ء کا ایک سردی سے ٹھٹھرتا دن اور برف آلود یخ بستہ رات تھی کہ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش پر بیروت کی الحمرا سٹریٹ پر ایک رنگ و روغن سے آراستہ تھرکتا لہکتا ایک طویل جلوس دیکھا۔ یہ لبنان کے عیسائیوں کا جلوس تھا جو عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش کا جشن منا رہے تھے۔ اس جلوس میں سینکڑوں بند اور کھلی گاڑیاں تھیں گاڑیوں کی چھتوں پر سانتا کلاز کا روپ دھارے بیسیوں نوجوان تھے۔ اس کے علاوہ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے بھڑکیلا اور دعوتِ گناہ دیتا لباس پہنے پاپ میوزک پر بے قابو ہو کر ناچ رہے تھے۔ ڈیک پر چلتے گانوں کا شور اتنا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ عیسائی اپنے نبی کے نام پر یہ بے ہودہ دھمال چوکڑی بعد دوپہر سے رات گئے تک کرتے رہے۔ یہی بے ہودہ مناظر نیوائیر نائیٹ پر دیکھنے کو ملے۔ شراب و کباب کی پوری بے حیائی کے ساتھ میں نے عیسائیوں کو 25 دسمبر اور 31 دسمبر کی رات جشن منانے کا عجیب و غریب انداز دیکھا۔ دس سال بعد 1983ء میں مَیں ملبرن آسٹریلیا میں تھا۔ وہاں بھی 25 دسمبر اور 31 دسمبر کی رات وہی مناظر دیکھنے کو ملے جو میں نے دس سال پہلے بیروت میں دیکھے تھے۔

اب آتے ہیں پاکستان کی جانب، چالیس پچاس سال پہلے ہم 12 ربیع اوّل بارہ وفات کے طور پر مناتے تھے۔ یہاں تصور یہ تھا کہ رسول کریم ﷺ کو 12 ربیع الاوّل کے دن اللہ کی طرف سے بلاوا آیا اور آپ ﷺ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بارہ وفات پر میٹھے چاول یا حلوہ پکایا جاتا۔ تلاوت قرآن کا اہتمام کیا جاتا اور رسول اللہ ﷺ کے نام پر ایصالِ ثواب کیا جاتا اور اپنے لیے بھی اور انتقال کر گئے اپنے پیاروں کے لیے بھی رحمت الٰہی اور مغفرت کی دعائیں کی جاتیں۔ دیگر علاقوں کا تو مجھے پتہ نہیں شمالی پنجاب کے اضلاع سرگودھا، خوشاب، چکوال، میانوالی، جہلم، راولپنڈی اور اٹک میں تو وہی کچھ ہوتا تھا جس کا میں نے سطورِ بالا میں ذکر کیا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے 12 ربیع لاالاوّل بارہ وفات سے عید میلاد النبی کی شکل اختیار کرتا گیا اور اسے رسول کریم ﷺ کے یوم پیدائش کے طور پر منایا جانے لگا۔ میرے علم کے مطابق مسلمانوں کے ہاں رسول اللہ ﷺ کے یومِ وفات کے سلسلہ میں 12 ربیع الاوّل پر تو اتفاق ہے لیکن یومِ پیدائش کے حوالے سے دن کے تعین میں اختلاف ہے۔ بہرحال اس سے قطع نظر اب 12 ربیع الاوّل

بڑے تزک واحتشام سے عید میلا دالنبی کے طور پر منایا جانے لگا ہے اور ماشااللہ اب تو 12 ربیع الاوّل کی صبح کا آغاز 21 توپوں کی سلامی سے ہوتا ہے۔ کم از کم پورے بارہ دن درود وسلام اور نعت خوانی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور 12 ربیع الاوّل کے روز رنگ و روغن سے بھر پور ہر بڑے شہر میں سینکڑوں ہزاروں جلوس نکالے جاتے ہیں جن میں جشن کے نام پر بہت کچھ ہوتا ہے لیکن الحمد للہ گندگی کے وہ مناظر نہیں ہوتے جو حضرت عیسٰی کے یومِ پیدائش پر عیسائیوں کا خاصا ہے۔ 12 ربیع الاوّل پر سیکورٹی ہائی الرٹ ہوتی ہے۔ سیکورٹی فورسز کے نوجوان ہزاروں کی تعداد میں ہر شہر میں جلوسوں کو سیکورٹی فراہم کرتے ہیں۔ منوں ٹنوں مٹھائیاں اور دیگر کھانے بنائے اور بانٹے جاتے ہیں۔ ٹی وی چینلز اپنے بے ہودہ اور حیا باختہ کمرشلز وقفوں میں ان کے ڈسپلے کے ساتھ عید میلا دالنبی کے جلوسوں کی کوریج بھی کرتے ہیں اور نعتوں بھرے دینی پروگرام بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ اہتمام کیے بغیر کہ عید میلا دالنبی کے موقع پر حُبِ رسول ﷺ اور اتباع دین متین کے تقاضوں کا خیال کرتے ہوئے کم از کم اُس دن حیا باختہ کمرشلز نہ دکھائیں اور عشقِ رسول ﷺ کے مقدس ماحول کو آلودہ نہ کریں۔

یہ تو سب کچھ رہا ایک طرف ذرا سوچیے کہ ہم ہر سال یومِ اقبال مناتے ہیں یومِ قائداعظم مناتے ہیں کبھی قائداعظم کا یومِ وفات اور کبھی قائداعظم کا یومِ پیدائش۔ بڑے بڑے لوگوں کی سالگرہ منائی جاتی ہے اور یومِ وفات یا برسی منائی جاتی ہے۔ دوسری قومیں بھی اپنے قومی راہنماؤں کے دن مناتے ہیں لیکن رسول کریم ﷺ وہ ہستی ہیں جسے رب العالمین نے رحمت للعلمین کہا۔ وہ جو قیامت تک سرورِ عالم ہیں اور جن کی بادشاہت روئے زمین کے سارے کناروں تک ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جس کے لیے ساری زمین مسجد بنادی گئی اور جس کی ہیبت سے کفر لرزہ براندام ہوا۔ جس پر نبوت ختم ہوئی اور جس کے بارے میں یہ فیصلہ لوحِ محفوظ پر ثبت کر دیا گیا کہ صبح نشور تک اب اللہ رب العزت کی غیر متبدل ہدایت اس کی لائی ہوئی کتاب کے سوا کسی اور جگہ نہیں مل سکتی لہذا یہ ہستی عام قومی راہنماؤں کی طرح کی ہستی نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ عظیم ہستی ﷺ اسی ماہِ مقدس میں منصۂ عالم پر جلوہ گر ہوئی اس لیے یہ مہینہ مقدس اور قابل رشک ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صدیقؓ و فاروقؓ، عثمانؓ وحیدرؓ بلالؓ و بوذرؓ صہیبؓ و سلمانؓ اور حسنؓ و حسینؓ نے جن کی اس ہستی سے محبت وعقیدت کو کوئی دوسرا انسان پہنچ ہی نہیں سکتا، نے نہ اس ماہ کو ماہ جشن منایا اور نہ اس دن کو بارہ وفات یا عید میلاد قرار دیا۔ ان صاحبانِ عظمت وعزیمت کے ہاں حب رسول ﷺ اور عشقِ رسول ﷺ کا تقاضا اتباع رسول ﷺ کی شکل میں ڈھل گیا۔ اتباع کی شکل میں وہ زندگی کے سارے سال، سال کے سارے مہینے اور مہینوں کے سارے دن جشن آمد رسول ﷺ مناتے رہے۔

بات دراصل یہ ہوئی کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کو روئے زمین کی تمام شخصیات سے بڑا تو مانا مگر انہی شخصیات کے زمرے سے بڑا مانا جن سے ہم اپنے زمانے میں مانوس ہیں اور ان کے یوم مناتے ہیں لیکن وہ جسے مجتبیٰ اور مصطفیٰ، صادق و امین، نذیر اور بشیر، احمد اور حامد کے القاب عطا کیے گئے وہ اس زمرے کا شخص ہی نہیں ہے۔ فی الحقیقت اس زمین پر سارے دن اس کے ہیں لیکن ہم اُسے صرف 12 ربیع الاوّل کے دن کی شخصیت بناڈالتے ہیں۔ وہ ہر مہینے کا ماہِ تاباں ہے لیکن ہم اُسے جب دیکھتے ہیں تو صرف ربیع الاوّل کے مطلع پر دیکھتے ہیں۔ تقویم خداوندی میں ازل سے ابد تک ہر سال اُسی عظیم ہستی کے نام معنون ہے مگر ہمارے کیلنڈر میں اُس ﷺ کا یومِ ولادت 12 ربیع الاوّل 570 بعد مسیح ہے۔ ہم جس طرح قائداعظم کی یاد کو 25 دسمبر اور علامہ اقبال کی یاد کو 9 نومبر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں اسی طرح جو شخصیت تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا اُسے بھی ہم صرف 12 ربیع الاوّل کے ساتھ منسلک رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ جس کی یاد کی شمعیں ہر وقت، ہر دل میں فروزاں رہنی چاہییں اور جس کا نام صبح شام ہر مسجد کے ہر مینار سے بلند ہونا چاہیے، یہ اس کی شان سے فروتر ہے کہ اُسے ایک یوم میلاد اور ایک ماہِ ربیع الاوّل کی شخصیت بنادیا جائے۔ وہ عزیز جہاں اور عزیز از جاں ایک دن ایک مہینے کی شخصیت نہیں بن سکتا۔ وہ ہر دن ہر ماہ ہر سال اور ازل سے ابد تک کے زمانے کی عظیم شخصیت ہے۔ اس عظم شخصیت کی اس فانی دنیا میں آمد کا جشن کامل اتباع کی شکل میں زندگی بھر منایا جانا چاہیے۔ رہ گیا دوسری قوموں کی تقلید میں (شاید؟) جلسے جلوس اور ریلیوں کا اہتمام کرنا اس سلسلہ میں مجھ جیسا کم علم بلکہ بےعلم آدمی کوئی کلام کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ میں یہ سوال علماءِ حق کے غور و فکر کے لیے چھوڑتا ہوں کہ مسلم اُمت کی راہنمائی انہی کی ذمہ داری ہے تاہم ایک بات کی طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ علماءِ کرام کو اپنے خطبوں خصوصاً خطبہ ہائے جمعہ میں رسول کریم ﷺ کی روشن تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے عوام الناس کے ذہن تیار کرنے چاہییں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ معاشرتی خرابیوں: از قسم جھوٹ، فریب، مکاری، حسد، رشوت ستانی، نفع اندوزی، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، تفرقہ بازی، چوری، ڈاکہ زنی، فحاشی، بے حیائی، اسراف اور رشتوں کی بے حرمتی غرباء اور مساکین کے حقوق اور پڑوسیوں کے احترام کی طرف خطبہ ہائے جمعہ میں موثر انداز میں بیان کرنے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ معاشرتی خرابیوں اور سماجی جرائم کی بیخ کنی کرنے والی احادیث کو عام کرنے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں علماءِ حق اگر اپنا کردار پوری منصوبہ بندی اور توجہ سے ادا کریں تو پاکستانی معاشرے میں امن، خوش حالی اور آزادی کی نعمت میسر آسکتی ہے اس سلسلہ میں سیرتِ طیبہ اور آپ ﷺ کی بعثت کو کسی مہینے یا کسی دن میں مقید کرنا احسن نہیں ہے بلکہ اسے زندگی کا رواں تصور بنانا ضروری ہے۔

فھم دین　　　　مدیر

# اسلام حریتِ فکر کا داعی ہے لیکن
# آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اسلام حریتِ فکر کا داعی ہے لیکن اقبال کہتا ہے کہ آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں اگر مندرجہ ذیل امور ذہن میں رکھے جائیں:

۱- اللہ تعالیٰ نے انسانی سرشت میں خیر وشر دونوں طرح کے رجحانات رکھے ہیں اور اسے انتخاب کی آزادی دی ہے کہ چاہے تو نیکی کے راستے پر چلے اور چاہے تو برائی کے راستے پر۔ لیکن ساتھ ہی انسان کو بتا دیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور برائی کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں میں ناکامی ہوگا اور اللہ کی اطاعت کا نتیجہ دونوں میں کامیابی۔ ساتھ ہی اللہ نے پیغمبر بھیج کر انسان کی خیر کی طرف رہنمائی کا بھی انتظام کیا ہے اور اس کی فطرت میں توحید کا تصور بھی رکھ دیا ہے۔

۲- اس کے بعد بھی اگر انسان حق کا انکار کر کے اپنی عقل اور ہوائے نفس کا اتباع کرتا ہے تو یہ آزادی کا غلط استعمال ہے، بے عقلی کا اور حیوانوں جیسا طرزِ عمل ہے اور شیطان کی پیروی ہے۔

۳- جب آدمی شعوری طور پر اپنی آزاد مرضی سے اللہ کی غلامی کا راستہ قبول کر لے اور توحید، آخرت اور رسالت کو مان لے تو اس کے بعد آزادی کا نعرہ لگانا یا اپنی مرضی کرنا یا اللہ ورسول کی نافرمانی کرنا...... یہ پرلے درجے کی سفاہت اور منافقت ہے۔ یہ آزادی نہیں بے راہ روی اور گمراہی ہے۔

- چونکہ دین اسلام نے قیامت تک باقی رہنا تھا اور اللہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی قرار دے دیا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رحمۃً بالناس اجتماعی امور میں ناقابل تغیر احکام دینے کی بجائے رہنمائی کے لیے بنیادی اصول دینے پر اکتفا کیا اور امت کے اہل علم کو حق اجتہاد دے دیا کہ وہ اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں تفصیلی نظام وضع کر لیں۔ تاہم یہ اجتہاد عامۃ الناس کا کام نہیں بلکہ صرف متخصص فقہاء اور مجتہدین کو ہی سزاوار ہے اور یہ اجتہاد قرآن وسنت کی نصوص کی روشنی میں اور مقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ آزادانہ رائے قائم کرنے کا نام نہیں ہے۔

- مسلمانوں کو کسی قیمت پر یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ وہ اسلامی اصول واقدار چھوڑ کر دوسرے ادیان یا تہذیبوں یا فلسفوں کی پیروی شروع کر دیں۔ یہ بلاشک وشبہ بے دینی اور گمراہی ہے۔

- مسلمانوں پر اللہ ورسول کی اطاعت ہی فرض ہے کچھ اور نہیں تاہم اجتہادی اور فروعی امور میں وہ کسی بھی ایسے عالم کی رائے پر عمل کر سکتے ہیں جس کے علم وتقویٰ پر انہیں اعتماد ہو تاہم اسے سبب تحزب وتعصب یا معیارِ حق وباطل بنانا غلط ہے۔

- اجتہاد کا انکار کرنا اور اسے اہمیت اور وزن نہ دینا یا پچھلے فقہاء کی آراء کو مقدس اور نا قابل تغیر ماننا، یہ تجمد ہے۔ صلاحیت کے بغیر اجتہاد کرنا یا کسی خلاف اسلام فکر وفلسفے سے متاثر ومرعوب ہو کر اس کی پیروی کی دعوت دینا یا اسلام کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد اس غیر اسلامی فکر وفلسفے کی روشنی میں کرنا اور اسلام کو اس کے مطابق ڈھالنے کی سعی کرنا، یہ تجدد ہے۔ تجمد اور تجدد دونوں غلط ہیں اور ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرنا ہی صحیح طرز عمل ہے۔

## ڈاکٹر شہباز احمد منج کا موقف

البرہان کے پچھلے شمارے میں اسلام میں حریت فکر کی تائید میں پروفیسر مقصود احمد صاحب کا جو مضمون شائع ہوا تھا ہم اس کے حوالے سے یہ مختصر اور اصولی گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ دریں اثناء ماہنامہ الشریعہ میں ڈاکٹر شہباز احمد منج صاحب کا وہ مضمون نما خط بھی ہماری نظر سے گزرا جو تقریباً اسی موضوع پر ہے جس پر ہم اظہار خیال کر رہے ہیں۔ ہم ڈاکٹر منج صاحب کے موقف کی تائید کرتے ہیں اور اس میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی عالم قرآن وسنت پر غور کے نتیجے میں کسی ایسی رائے پر پہنچتا ہے جو پہلوں سے مختلف ہو (یعنی 'تفرد' ہو) تو یہ قابل مذمت نہیں ہے لیکن اگر کسی صاحب کی پوری فکر ہی تفردات پر مشتمل ہو اور امت کی چودہ سو سالہ فکری روایت اور تعامل کی نفی کرتی ہو اور گویا یہ تاثر دیتی ہو کہ دین کو پچھلے چودہ سو سال میں کوئی صحیح نہیں سمجھا سوائے اس کے، تو اس کا غلط ہونا اغلب ہے اور اگر ایسی فکر کسی غیر اسلامی فکر وفلسفے سے مطابقت رکھتی ہو تو اس کا تجدد اور گمراہی ہونا واضح ہے۔ اللہ کرے یہ اختصار مخلِ فہم نہ ہو۔

فهم دين

ڈاکٹر انوار احمد بگوی ☆

# دینی مدارس کے نام

## حکومتی مداخلت کا انتظار کیے بغیر مدارس خود ہی اصلاحی اقدامات کر لیں

یہ بات یقیناً ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ موجودہ دہشت گردی میں دینی مدارس کا کوئی کردار نہیں۔ بحیثیت تعلیمی اداروں کے وہ عمدہ کام کر رہے ہیں۔ معاشرے کی دینی رسوم و رواج بجالانے میں مدد کر رہے ہیں لہٰذا ان کی حوصلہ افزائی اور ان کے ساتھ تعاون کی ضرورت ہے۔ تاہم اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کسی بھی انسانی کاوش کی طرح مدارس کے نظام میں بھی اصلاحات اور بہتری کی گنجائش موجود ہے۔ حکومت اگر چاہے تو علماء کرام کے تعاون سے اور ان کی مشاورت سے یہ اصلاحات لا سکتی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل سے بھی اس سلسلے میں مدد لی جا سکتی ہے جس میں ہر مکتب فکر کے علماء کرام موجود ہیں۔

ایک طالبانہ غور و فکر کے نتیجے میں راقم کی درخواست ہے کہ علماء کرام مندرجہ ذیل شعبوں مین بہتری لانے کے لیے خود ہی پیش قدمی فرمائیں:

☆ قرآن حکیم کو ساری دینی تعلیم کا مرکز بنایا جائے۔ ☆ عربی زبان میں مہارت لیکن تعلیم ساری اردو میں ہونی چاہیے۔ ☆ تقابل ادیان ☆ فقہ پر ضرورت سے زیادہ زور نہ دیا جائے۔ ☆ عصری علوم سے گہری واقفیت ☆ طرق تحقیق کا باقاعدہ کورس ☆ تربیت اساتذہ کا اہتمام ☆ طلباء کو دعوتی و اصلاحی کاموں کی باقاعدہ تربیت ☆ علماء کی تنخواہوں اور حالات کار کو بہتر بنانا ☆ مدارس میں سخت سزا کے تصور کا خاتمہ ☆ مدارس کے مجموعی ماحول کو بہتر بنایا جائے اور ہم عصر دنیا کے برابر لایا جائے۔ ☆ مدارس کے نصابات اور تعلیمی ماحول کو عالم اسلام کی اسلامی یونیورسٹیوں کے برابر لایا جائے اور تعلیم میں تنوع پیدا کیا جائے۔ ☆ دینی مدارس کے طلبہ کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ مسجد و مدرسہ کے علاوہ معاشرے اور ریاست کے دوسرے اداروں میں بھی خدمات انجام دے سکیں۔

ہماری رائے میں اگر مدارس اس طرح کی اصلاحات پر کام کریں تو ان کا کردار معاشرے کے لیے پہلے سے زیادہ مفید اور موثر ہو جائے گا۔ انہیں چاہیے کہ وہ حکومتی مداخلت کا انتظار نہ کریں بلکہ خود ہی اصلاح کا فیصلہ کر کے ضروری اقدامات کر لیں تا کہ کسی کو مداخلت کا موقع ہی نہ ملے۔

---

☆ یکے از خدام علمائے بگویہ و سابق ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ پنجاب، drbugvi@hotmail.com

تعلیم و تربیت　　مولانا اشرف علی تھانویؒ

# علی گڑھ اور مولانا قاسم نانوتویؒ

سر سیّد نے جب علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تو انھوں نے اپنے ایک صاحب سے کہا کہ تم گنگوہ جاؤ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے بعد سلام مسنون میری جانب سے عرض کرو کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے، اس کے مقابل دوسری غیر مسلم قومیں ترقی کر رہی ہیں، مسلمانوں کی ترقی کے لیے انگریزی تعلیم کے لیے ایک کالج کی بنیاد ڈالی ہے، اس کام میں آپ بھی شرکت فرمائیں اور ہاتھ بٹائیں تو بہت جلد کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ یہ صاحب پیر جی محمد عارف صاحب تھے۔ یہ پیر جی گنگوہ حاضر ہوئے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ وہ سر سید کی طرف سے پیغام لے کر آئے ہیں، اس کے بعد وہ پیام پیش کیا۔ حضرت نے پیام سن کر فرمایا کہ میری تو ساری عمر قال اللہ وقال رسول اللہ میں گزری ہے، مجھے ان چیزوں کا زیادہ تجربہ نہیں، ہاں، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو ان چیزوں میں زیادہ بصیرت حاصل ہے، اُن سے جا کر بیان کیجیے، وہ اگر شرکت کو قبول فرمائیں گے تو ہم سب اُن کے ساتھ ہیں۔

یہ گفتگو ہونے پائی تھی کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ تشریف فرما ہوئے، مولانا کی آمد اتفاقی تھی۔ پیر جی صاحب نے سر سید کا پیام اُن کو پہنچایا، حضرت مولانا نے سن کر فرمایا کہ پیر جی! لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ شخص ہوتا ہے جس کی نیت اچھی ہے مگر عقل نہیں ہوتی۔ دوسرا وہ شخص ہے جس میں عقل ہوتی ہے، مگر نیت اچھی نہیں ہوتی۔ تیسرا وہ شخص ہوتا ہے کہ اُس کی نہ نیت اچھی ہوتی ہے اور نہ عقل ہوتی ہے، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ سر سید کی نیت اچھی نہیں، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اُن کو عقل کافی نہیں۔ اس لیے کہ وہ جس چیز کے ذریعہ مسلمانوں کو معراج ترقی پر لے جانا چاہتے ہیں وہی چیز تو ان کے تنزل کا سبب ہوگی اور تباہی اور بربادی کا بھی۔

پیر جی صاحب نے عرض کیا کہ جس چیز کی کمی حضرت نے سر سیّد میں محسوس فرمائی ہے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے تو آپ حضرات کی شرکت کی ضرورت ہے۔ مولانا نے اس کا جو جواب دیا، غیر عارف اس کا جواب دے ہی نہیں سکتا تھا، حضرت مولانا نے فی البدیہ فرمایا کہ جی ہاں، یہ تو صحیح ہے، لیکن جس کام کا بانی اپنے کام کی بنیاد میں جو چیز شامل کرتا ہے، اُس کے جذبات اور نیت کے آثار اُس چیز میں پیوست ہو جاتے ہیں، وہ اُس سے جدا نہیں ہوتے اور اس شخص کے شروع کردہ کام اور اس کی بنیاد کی

اصلاح نہ صرف مشکل ہے، بلکہ عادۃً محال ہے۔اوراس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک تلخ درخت بویا جائے اورایک بزرگ کوشربت کا مٹکا دے کرعرض کیا جائے کہ وہ اس کی بنیاد میں ڈالتا رہے،مگر جب وہ درخت برگ و باراور پھل پھول لائے گا تو وہ سب تلخ ہوں گے۔اسی طرح یہاں بھی کسی عالم اور بزرگ کوشریک کرکے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے،تب بھی یہ کمی پوری نہیں ہوسکتی...... بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ خود شرکت کرنے والے میں اس کے اثرات آجائیں، چنانچہ تحریک خلافت کے زمانہ میں جب کچھ لوگ علی گڑھ کالج کو بند کرنے کے ارادہ سے علی گڑھ پہنچے تو وہاں انہوں نے یہی کہا کہ مسلمانوں کو سارے نقصانات اس کالج اوراس کی تعلیمات کی بدولت پہنچے ہیں۔اس نے ہندوستان میں انگریزیت،عیسائیت اور دہریت کوفروغ دیا ہے۔ یہ کہنے والے بڑے بڑے مسلمان لیڈر تھے جو اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ میں نے سن کر کہا کہ یہ لوگ تو پچاس برس کے تجربہ کے بعد اس بات کو سمجھے ہیں جب کہ ہمارے ایک مبصر نے یہی بات اس کی بنیاد پڑتے وقت کہہ دی تھی کہ اس کے یہ نتائج ظاہر ہوں گے۔(ملفوظات جلد۸،صفحہ۹۹۔۱۰۰)

## غور فرمائیے

دانشوراور مفکر کسی قوم کا دماغ ہوتے ہیں۔ایک مدبر کی فکری لغزش معاشرے کو اجتماعی اعتبار سے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر سکتی ہے۔ ہمارے مذہبی طبقات کے دانشور ہمارے علماء کرام، وارثانِ منبر ومحراب، حاملانِ لوح وقلم،صاحبانِ نشرواشاعت اورار بابِ مدارس و تنظیمات ہی ہیں۔ ہمارے ہاں پستی کے جو بھی عناصر پائے جاتے ہیں وہ دراصل اس حلقۂ دانشوراں کے شعوری زوال وانحطاط کا نتیجہ ہیں۔ جب تک ہم من حیث القوم اپنی نظری و فکری تشکیلِ نو نہیں کر لیتے ،ہماری تمام ترنجی وآفاقی سرگرمیاں خاک درہوا ہوتی رہیں گی۔

(ڈاکٹر انواراحمد بگوی)

تعلیم و تربیت

سید خالد جامعی ☆

# اسلامی اسکولوں میں ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں؟ (۲)

## ہر کتاب کو اسی زاویے سے دیکھیے

اگر یہ رنڈی روزانہ بارہ گھنٹے کام کرے تو اس کی روزانہ کی آمدنی ۳۶ ہزار ڈالر ہے جو ایک امریکی استاد کی سالانہ آمدنی ہے یہ رنڈی ماہانہ دس لاکھ اسی ہزار ڈالر کماتی ہے جبکہ امریکی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دو لاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے۔ رنڈی کا لفظ اب متروک ہو گیا ہے کیونکہ معاشرے میں گناہ اور گناہ گار کو پسند کیا جا رہا ہے۔ اسے برداشت [tolerance] کہتے ہیں یہ آزادی کے عقیدے کا نتیجہ ہے ہر پھول کو کھلنے دو۔ آپ نیک کام کریں دوسرے کو برے کام کرنے دیں۔ یہ دونوں کا حق ہے۔ عہد حاضر حق [Right] کے منہاج کا عہد ہے آپ جو چاہے کریں کہ حق [Good] کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہر شخص کا محض دعویٰ ہوتا ہے ہر شخص کو حق [Right] ہے کہ جسے خیر [Good] سمجھے اپنی ذاتی زندگی میں اسے خود اختیار کرے دوسرے کو اختیار کرنے پر مجبور نہ کرے اپنی مرضی آزادی اختیار مطلق سے آپ جس خیر کو اختیار کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں خیر کی بحث بے معنی ہے خیر کچھ نہیں ہوتا اصل چیز پیسہ ہے۔ بس پیسے کماؤ جدید نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کا یہی مقصد ہے۔

حسین نصر نے بھی یہ بات لکھی ہے کہ مغرب میں اسپورٹس ہیرو کی ایک سال کی آمدنی ایک بہت بڑے سائنس داں اور عظیم مفکر کی پوری زندگی کی آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے۔

There are now sports heroes who make more of a salary in one year than the greatest westren scientists or scholars will do in his or her life time. [S. H. Nasr: *A Young Muslim's guide to the modern world*, Suhail Academy Lahore, 1988, p.232]

مشہور فلسفی مائیکل سانڈل لکھتا ہے کہ امریکہ میں اسکول کا ایک عام استاد ایک سال میں ۴۳ ہزار ڈالر کماتا ہے لیکن ڈیوڈ لیٹر مین جو رات گئے فحش گوئی کے پروگرام کی میزبانی کرتا ہے اس کی سالانہ آمدنی اکتیس ملین ڈالر ہے امریکہ کا سب سے عاقل اہم ترین آدمی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دو لاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے اور ایک ٹیلی ویژن شو کی جج جوڈی ایک سال میں ۲۵ ملین ڈالر کما لیتی ہے۔

☆The average schoolteacher in the United States makes about $43,000 per year. David Letterman, the late-night talk show host, earns $31 million a year.

☆John Roberts, chief justice of the U.S. Supreme Court, is paid $217,400 a year. Judge Judy, who has a reality television show, makes $25 million a year. [*Justice, What's The Right Thing To Do?*, Michael J. Sandel ,p.162]

اس صورت حال میں بچے اسکول جانا پسند کریں گے یا وہ کام کرنا پسند کریں گے جس کے حصول کے لیے صبح سے رات تک پڑھنے لکھنے اور سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ جس سے ان کی آمدنی بے پناہ ہو جائے۔

اسلامی اسکولوں میں جب آپ بچے کو اسلام آخرت اور بہترین آمدنی بہترین معیار زندگی بہترین دنیا یعنی دو مختلف تصورات خیر کی طرف بلاتے ہیں تو بچہ کون سا تصور خیر اختیار کرے گا؟ اگر آج کی نسل معیار زندگی بلند کرنے کے لیے غیر اخلاقی پیشوں کو بے تابانہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اس کا سبب ہمارے غلط نظریات ہیں ہر تہذیب میں تصور خیر (Concept of Good) صرف ایک ہوتا ہے اسلامی تہذیب کا تصور خیر التوحید ہے مغرب کا تصور خیر آزادی ہے جس کی دو شکلیں ہیں ایک تجریدی [Abstract] یعنی ووٹ [Vote] دوسری ٹھوس [Concrete] وہ ہے سرمایہ [Capital]- سرمایے کے بغیر آزادی کا حصول ممکن نہیں اور جدید نظام تعلیم اور اس کے قائم کردہ ادارے سرمایہ داری کے لیے شاہ دولہ کے چوہے [Corporate slaves] پیدا کرتے ہیں یہ غلام سرمایہ، عیاشی، آزادی کے سوا کچھ اور سوچنے کچھ اور کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ جس طرح دریا کا پانی بہہ کر سمندر کی طرف جاتا ہے جس طرح کچھوے کا بچہ اس زمین پر آنکھ کھولتے ہی سمندر کا رخ کرتا ہے اسی طرح جدید نسل تعلیم کے بحر سے باہر نکلتے ہی دنیا پرستی اور عیش پرستی کی طرف دوڑتی ہے۔

تصور خیر کی بحث بنیادی بحث ہے خیر [Good] اس پیمانے کو کہتے ہیں جس پر ہر شے کو پرکھا جا سکے لہٰذا پیمانہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے پیمانہ کبھی دو نہیں ہو سکتے جب ہم دین اور دنیا کو برابر سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ A=B دوسرے معنوں میں B=A بنیادی سوال یہ ہے کہ دین کو دنیا کے پیمانے پر پرکھا جائے گا یا دنیا کو دین کے پیمانے پر پرکھا جائے گا؟ اگر دونوں برابر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کو دنیا کے پیمانے پر پرکھنا بالکل درست ہے لہٰذا عصر حاضر میں دین وہی ہے جو دنیا کے پیمانے پر پورا اترے سرسید اور شبلی کے الفاظ میں سچا دین وہ ہے جو جدید تہذیب و تمدن اور زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکے تفصیلات کے لیے

حالی کی حیات جاوید ، ضیاءالدین لاہوری کی افکار **سر سید شبلی نعمانی کی علم کلام اور الکلام اور سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی** کا مطالعہ کیجیے دوسرے معنوں میں ہم دین کے مطابق ڈھلنا نہیں چاہتے بلکہ دین کو اپنے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ہم قرآن وسنت کے مقلد نہیں شریعت ہماری مقلد ہے شریعت حاکم نہیں ہمارا نفس حکم ہے۔

چونکہ دین اس امتحان میں ناکام ہے وہ دنیا پرستی، مادّہ پرستی [Materialism] اور مادہ پرستی [Women Worship] اور عیش پرستی کی دلیلیں مہیا کرنے سے قاصر ہے لہٰذا دین کی تشکیل جدید، تعبیر نو، تعمیر نو، بلکہ تخریب نو [Re construction of Religious thought] کا کام زور وشور سے جاری ہے۔ ہماری نئی نسل اگر دنیا پرست بن گئی ہے بہترین مستقبل کے لیے ترک وطن کر کے دارالحرب میں قیام اگر اس کی اولین ترجیح ہے اگر عالم اسلام سے ذہانت کا انخلا [Brain Drain] ہو رہا ہے ہر شخص دولت کے زیادہ سے زیادہ حصول کو اگر اپنا مقصد زندگی بنا چکا ہے تو اس کا سبب ہمارا یہ نیا عقیدہ ہے کہ دین و دنیا برابر ہیں کیونکہ دنیا پہلے ہے آخرت بعد میں۔ لہٰذا دنیا پہلے دین بعد میں بعض جدیدیت پسند کہتے ہیں کہ قرآن میں بھی یہی آتا ہے **ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنه** ڈاکٹر حسین نصر کے بیٹے ولی رضا نصر کی کتاب Islamic Capitalism اب نئے نام Meccanomics سے منظر عام پر آئی ہے جو اسلامی دنیا میں سرمایہ دارانہ اسلام یا اسلامی سیکولر ازم کے جدید مظاہر، آثار سے آگاہ کرتی ہے جو مغرب کو مطلوب ہے ہمارے تعلیمی ادارے ایسی ہی نسل تیار کر رہے ہیں جو رسوم ورواج عادات واطوار اور بعض مظاہر کی سطح پر مذہبی ہو لیکن ذہنی، قلبی، عقلی طور پر مادہ پرستی کی غلام ہو۔

جب آپ مغربی تصور خیر زیادہ آمدنی بہترین معیار زندگی بلکہ معیار زندگی میں مستقل اور مسلسل اضافے کو بھی اسلامی تصور خیر کے طور پر قبول کریں گے کہ اس میں کیا ہرج ہے تو آپ کی بیٹی شریف عورت بیوی، ماں نہیں سپر اسٹار بننا پسند کرے گی آپ کے بچے عالم دین نہیں بنیں گے کیوں کہ یہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ نہ وہ کسی ایسے پیشے اور فن کو اختیار کریں گے جس میں کم پیسے ملتے ہوں۔ کیونکہ زندگی کا مقصد آزادی [Freedom]، سرمایہ کا ارتکاز [Accumolation of Capital] معیار زندگی کے خدا کی پرستش [Worship of standard of Living]، HDI میں اضافہ اور عیش وعشرت لذت پرستی [Hedonism] ہے۔علم وہ ہے جس سے ترقی اور اچھی نوکری ملے۔ اتنا پڑھ لکھ کر اگر اتنے کم پیسے ملتے ہیں تو ایسے علم کا کیا فائدہ؟ جب زندگی کا مقصد معیار زندگی میں اضافہ ہے تو اس مقصد کی خاطر دین، اخلاق، تہذیب، تمدن، اقدار روایات سب کچھ قربان کی

جاسکتی ہیں ہرعقیدہ اورایمان خواہ صحیح ہو یا غلط اس کی ایک قیمت ہوتی ہے دنیا پرستی کی ایک قیمت ہے جو نئی نسل ادا کرنا چاہتی ہے دین و دنیا کو یکساں سطح پر رکھنے کی بھی ایک قیمت ہے۔ بالکل اسی طرح توحید پرستی کی بھی ایک قیمت ہے جو سب کو معلوم ہے مگر ہم اسے ادا کرنا نہیں چاہتے لہٰذا مذہبی تاویلوں میں الجھے رہتے ہیں۔ دو مختلف بلکہ متضاد تصورات خیر کو یکساں سمجھنے کی اس بنیادی غلطی کے باعث ہمارے اسلامی اسکولوں میں دی گئی اسلامی تعلیمات، تجوید کے اسباق، ان بچوں کی درست سمت سفر متعین نہیں کرسکیں گے۔

جدید اسکول اٹھارہویں صدی کے جدید مغرب کی ایجاد ہیں لہٰذا ان اسکولوں اور اس کے نظام سے وہی تصویریں نکلیں گی جو مغرب کو پسند ہیں۔ اصل سوال وہ ہے جو شیر کے جواب میں پنہاں ہے کہ یہ تصویریں نے نہیں بنائی ورنہ میں شیر کی تقدیر بدل دیتا یہ تصویر شیر بناتا تو انسان وہاں ہوتا جہاں اب شیر کو دکھایا گیا ہے یعنی شیر کے قدموں میں انسان۔ بالکل اسی طرح یہ جدید مغربی اسکول ہماری علمیت، اسلامی تاریخ وتہذیب نے تخلیق نہیں کیے مگر اب یہ اسکول مغرب سے متاثر ہوکر ہم نے بھی بنا لیے ہیں تو کم از کم ان اسکولوں سے نکلنے والی نسل کی تصویر کیسی ہونی چاہیے؟ ہم سب کا دینی، ملی، اخلاقی، تہذیبی، ایمانی فریضہ ہے کہ اس سوال کا جواب مل جل کر تلاش کریں ابتدائی کوشش کے طور پر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے جنریشن اسکول کی کتابوں کا مختصر تجزیہ پڑھیے:

پہلی کتاب *The Pan Cake* کہانی ہے۔ شیف یعنی باورچی سر پر سفید ٹوپی اوڑھے سفید کوٹ پہنے ہوئے نہایت مہذب طریقے سے باورچی خانے میں کیک بنانا سکھا رہا ہے ایک پیالہ لو۔ اس میں آٹا اور انڈے Eggs and Flour ڈالو اور اس میں دودھ Milk ڈالو ان اجزاء کو پھینٹ لو۔ اب حلوہ بھوننے والے برتن (فرائنگ پین) میں مکھن ڈالو، باورچی مکھن برتن میں ڈال کر اس میں دودھ، انڈے آٹے کا آمیزہ شامل کردیتا ہے اور پھر کیک بن جاتا ہے وہ کیک ہوا میں اچھال کر کرتب دکھا رہا ہے۔ باورچی خانہ میں کتا بھی بیٹھا ہوا ہے بچے کیک کے اچھلنے کا منظر حیرت سے دیکھ رہے ہیں بچے برتن ہاتھوں میں پکڑ کر دوڑ رہے ہیں اور کیک اچھال کر اسی برتن میں گرا رہے ہیں یہ کمالات ہیں ایک لڑکی کیک اچھالتی ہے تو وہ کیک فرائی پین میں واپس گرنے کے بجائے محترمہ کے سر کو چھو لیتا اور وہیں قیام پذیر ہو جاتا ہے پیچھے آنے والا ہجوم چیخ رہا ہے خوش ہو رہا ہے تالیاں بجا کر شور مچا رہا ہے لکھا ہے The Pan cake race ایک اسلامی اسکول میں تہذیب کا سبق ہم مغربی طور طریقوں سے سیکھتے ہیں اس کی دلیل عموماً یہ دی جاتی ہے کہ مغرب کی غالب تہذیب، تمدن، معاشرت سے واقفیت ضروری ہے اگر ہم مغرب کی چیزوں سے واقف نہ ہوئے تو مغرب سے بہت زیادہ مرعوب ہوں گے۔ واقفیت اس مرعوبیت کو کم کردے گی۔

دوسری کتاب کا نام ہے *Who is it* ایک چراغ جل رہا ہے بچہ سامنے کھڑا ہے پیچھے کھڑے ہوئے دو بچوں کا سایہ دیوار پر پڑ رہا ہے بچے سایہ دیکھ کر حیران ہیں پوچھتے ہیںWho is it بچے بتاتے ہیں کہ یہ Biffاور Chip کا سایہ ہے پھرامی اور Kipper کا سایہ آجاتا ہے امی ہاتھ میں مچھر مار آلہ لے کر ایک مکھی مار رہی ہیں پھر کُتے کا سایہ آتا ہے پھر خلائی انسانSpace man کا سایہ نظر آتا ہے بچے حیران ہیں کہ خلانورد یہاں کیسے آ گیا ہے پھر والد محترم ہنستے ہوئے آتے ہیں بچے کہتے ہیں No, Its Dad ارے یہ تو ابو جان ہیں موصوف کے منہ میں سگار ٹائپ پائپ لگا ہوا ہے جنگل کے طوطوں جیسے رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔عصر حاضر کا رنگ یہی ہے بڑے بوڑھے اور مذہبی لوگ بھی اب شوقیہ رنگ برنگے کپڑے پہنتے ہیں۔اور سفید کپڑے پہننے والوں پر اعتراض کرتے ہیں ۔کوئی ڈاکٹر،نرس، باورچی Cheif،ٹریفک پولیس، نیوی کے افسروں سے نہیں پوچھتا کہ تم ہمیشہ سفید کپڑے کیوں پہنتے ہو کوئی ڈاکٹر سے نہیں پوچھتا کہ زخمی کو ہمیشہ سفید پٹی کیوں باندھتے ہو کوئی پولیس اور فوجی سے نہیں پوچھتا کہ ہمیشہ ایک رنگ کا لباس کیوں پہنتے ہو؟

تیسری کتاب کی کہانی ہے *The Lost Teady* امی اور بیٹا سفر کے لیے نکلتے ہیں تو منے میاں بھالو لے کر بس میں بیٹھتے ہیں۔بس سے اترتے ہوئے بچہ بھالو نشست پر بھول جاتا ہے بس چلی جاتی ہے اور بچہ رونے لگتا ہے۔میرا بھالو میرا بھالو۔گھر پہنچتے ہیں تو منے میاں نہایت غمزدہ آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں اداسی نے گھر کے در و بام پر اپنے بال پھیلا دیے ہیں تمام بہن بھائی طرح طرح کے قسم قسم کے کھلونوں کا ان کے بستر پر ڈھیر لگا دیتے ہیں مگر وہ تمام کھلونے مسترد کرتے ہیں کوئی ان کو پسند نہیں آتا کسی پر نظر نہیں ٹھہرتی عالی شان گھر کے عالی شان کمرے میں گھڑی لگی ہے،مہنگا ٹیبل لیمپ رکھا ہے شان دار مسہری ہے قیمتی خوبصورت قالین کارپیٹ بچھا ہوا نرم نرم موٹے موٹے تکیے ہیں کرسی پڑی ہوئی ہے دیواروں پر مصوری کے شاہکار لگے ہیں کھڑکی میں بہت بڑا شیشہ لگا ہے جس سے رات کا منظر، عمارتیں، چاند،ستارے، پودے، درخت سب نظر آرہے ہیں مگر منے میاں کا غم کم نہیں ہوتا آنسو تھمتے نہیں، ہچکیاں،سسکیاں بند نہیں ہوتیں روتے روتے سو جاتے ہیں رات جیسے تیسے گزر جاتی ہے صبح سویرے امی ان کو بس کمپنی کے دفتر لے جاتی ہیں جہاں مسافروں کی کھوئی ہوئی اشیاء املاک وغیرہ Lost Property کا مال خانہ (اسٹور) ہے جہاں بس سے ملنے والی اشیاء جمع کی جاتی ہیں اور مسافروں کو واپس کی جاتی ہیں منے میاں کو بھالو مل جاتا ہے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔یہ کس قسم کا بچہ خلق ہوا ہے جو دنیا بھر کے کھلونے پا کر بھی خوش نہیں ہے اور اس بچے کی تعلیم تربیت اصلاح کرنے والا بھی کوئی نہیں سب اس کی ہر خواہش پوری کر رہے ہیں جدید اکنامکس اسی انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے لہٰذا اکنامکس میں انسان انسان

نہیں Homoeconomicus کہلاتا ہے ایک افادی، حسی، تجربی، لذت پرست وجودا کنامکس انسان کو طالب الذات جانور قرار دیتی ہے Man is a pleasure seeking animal ظاہر ہے طالب الذات وہی کام کرے گا جو منے میاں کررہے ہیں لہٰذا جدیدیت کا مسئلہ نفس مطمئنہ سے کامل محرومی ہے۔

چوتھی کتاب کی کہانی کا عنوان ہے *Look Out* عالی شان گھر ہے جس میں شان دار موٹر سائیکل بچوں والی کھڑی ہے گھر کے اندر صحن چمن ہے، بہترین چمکتی دمکتی گاڑی کھڑی ہے گھاس میں منے میاں موٹر سائیکل چلانے کی تیاری کررہے ہیں۔ سر پر ہیلمٹ باندھ رہے ہیں امی گھاس کاٹنے کی مشین سے گھاس کاٹ رہی ہیں منے میاں موٹر سائیکل چلاتے ہیں تو کئی گملوں کو گرادیتے ہیں۔ شور دھواں پھیل رہا ہے کتا بھاگا ہوا آرہا ہے بلّی خوف زدہ ہے آواز سے — امی نے ہاتھ میں دستانے پہنے ہوئے ہیں وہ باغ بانی Gardening میں مصروف ہیں مگر چیخ رہی ہیں کہ تم کیا کررہے ہو منے — امی نے پتلون قمیض پہن رکھی ہے اسلام نے کب منع کیا ہے کہ عورت مرد جیسے کپڑے نہ پہنے اور ویسے بھی دنیا کو سب سے پہلے عورت مرد کی مساوات کا سبق تو اسلام نے ہی دیا ہے اس طرح کے کپڑے پہن کر ہی عورت کو آزادی کا احساس ہوتا ہے بہن خیمے میں بیٹھی ہے خیمے کے اوپر تار پر بہن کے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں منے میاں غلط موٹر سائیکل چلاتے ہیں خیمے کی میخ نکل جاتی ہے کپڑوں کا تار منے کی گردن میں — تمام کپڑے گر جاتے ہیں بہن چیختی ہے منے میاں گھر میں گھس جاتے ہیں پھلوں کی الماری دوات کی بوتلیں رنگ — منظر نامے [Scenery] سب گرادیتے ہیں کمرے کا حشر نشر ہوجاتا ہے ابا امی حیرانی سے دیکھتے ہیں مگر چپ ہیں ڈبل روٹی اِدھر اُدھر اڑ کر گر رہی ہے آخر کار امی آجاتی ہیں راستہ بناتی ہیں گملے رکھتی ہیں سڑک کا منظر پیش کردیتی ہیں ایک بچے کے ہاتھ میں رکو Stop کا گتہ دیتی ہیں ایک بچی کے ہاتھ میں بچو رک جاؤ Stop Children کا پلے کارڈ ہے کتا نگرانی کررہا ہے راستے بن گئے ہیں ٹریفک کا نظام قائم ہوگیا ہے منے میاں مہذب (سولائزڈ) ہوگئے ہیں اب وہ طے شدہ راستے پر سفر کریں گے انشاءاللہ نقصان نہیں ہوگا نظم وضبط تو اسلام بھی سکھاتا ہے۔ مغرب نے یہ سب کچھ اسلام سے لیا ہے۔ اسلام کی میراث ہم آکسفرڈ کی کتابوں کے ذریعے مسلمانوں کو منتقل کررہے ہیں اس میں کیا ہرج ہے؟

پانچویں کتاب کا نام ہے *Fun at the Beach* سرورق پر ایک عورت نیکر پہنے بچی کے ساتھ ساحل سمندر کی سیر کررہی ہے منے میاں ابا امی بہن بھائی کتے کے ساتھ جارہے ہیں ایک آدمی تماشہ دکھا رہا ہے آئینے کے اندر امی ابا کی شکل بدل گئی ہے آئینوں میں کتے امی ابا بچے عجیب وغریب نظر آرہے ہیں سب کا حلیہ خراب ہوگیا ہے کتا بھی بالکل ٹیڑھا پتلا باؤلا لگ رہا ہے بچے کھیلوں سے لطف اندوز

ہور ہے ہیں ابا کُتّے کو پکڑے کھڑے ہیں۔اب کُتے کو کُتوں کے مخصوص علاقے Dog Area میں چھوڑ دیا گیا ہے واپس جاتے ہوئے ابو کُتّے کو لینے آئے تو وہ اتنی زور سے اچھلا کہ ہر طرف مٹی اڑنے لگی بچے کہہ رہے ہیں- Oh Floppy ہر کہانی کا مقصد لطف، مزہ، ہنسی، مذاق، enjoyment کیونکہ یہی زندگی ہے جان ہے تو جہان ہے یہی پیغام ہے—اسی لیے تعلیم بھی اب کھیل تماشہ بنادی گئی ہے Fun to learn اسی کا نام ہے جس زندگی کا آغاز لہوولعب سے ہو اس زندگی میں سنجیدگی تحمل اور دینی اقدار مذہبی مزاج نبوی طریقے کیسے زندہ رہ سکتے ہیں لہٰذا لہوولعب کی دینی تعبیر و تفسیر عام ہو رہی ہے۔

تصویری کہانی ہے At School منے کی امی روتے دھوتے منے کو اسکول کے پہلے دن کھینچتے ہوئے اسکول میں زبردستی لے جا رہی ہے منے نے اسکول کے جنگلے کا کونا پکڑ لیا ہے وہ اندر نہیں جانا چاہتا ماں زبردستی کھینچ رہی ہے وہ رو رہا ہے بچے کھڑکی سے منے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں ٹیچر بھالو لے کر منے کو بہلا رہی ہے پچکار رہی ہے آخر کار ماں زبردستی بچے کو اندر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ یہ عجیب ماں ہے جو بچے کو گود میں اٹھانے کے بجائے کھینچا تانی کر رہی ہے محبت تو اس عمل سے ظاہر نہیں ہے منے میاں اندر جا کر بہت خوف زدہ ہیں۔ بچے ٹیچر انہیں محبت سے کھلونے دکھاتے ہیں آخر کار لالچ میں منے میاں کلاس میں آ جاتے ہیں وہاں بچے عجیب عجیب کام کر رہے ہیں کلاس زبردست ہے کچھ بچے میز کرسی پر بیٹھ کر چھری چاقو کانٹے سے کھا رہے ہیں کچھ استری کر رہے ہیں کچھ پکا رہے ہیں کچھ کھیل رہے ہیں ہر طرف سامان ہی سامان ہے منے میاں بھی کھیل کے طلسم خانے میں گم ہو جاتے ہیں وہ بھی کچھ پکانے لگتے ہیں اتنے مزے ارے یہ تو اسکول نہیں ہے یہ تو گھر میں کھیلوں کا کمرہ ہے منے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اسکول کا وقت ختم ہو جاتا ہے امی منے کو لینے آتی ہیں منے میاں گھر جانے پر آمادہ نہیں ٹیچر خدا حافظ کہہ رہی ہیں منے میاں رو رہے ہیں جنگلہ پکڑ کر زور لگا رہے ہیں امی کھینچ تان کر رہی ہیں پہلے اسکول جانے پر راضی نہیں تھے اب اسکول سے آنے پر راضی نہیں ہیں۔امی پہلے بھی منے کو کھینچ رہی تھیں اب بھی کھینچ رہی ہیں ماں کی مامتا سے محروم ایک کریہہ وجود ہے جو بچے سے زور آزمائی کر رہا ہے اسے گود میں اٹھاؤ پیار کرو۔اسے اسکول کے جبر سے آزاد کرواتنے چھوٹے بچے کو اتنی کم عمر میں اسکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے یہ مشورہ عصر حاضر کے انسان کے لیے نامعقول، احمقانہ، ظالمانہ ہوگا۔کیونکہ اس کی عقلیت نے اس جبر کو بہ رضا و رغبت قبول کر لیا ہے۔عہد حاضر کے لوگ پابندی، جبر، تسلط، کو سخت ناپسند کرتے ہیں لہٰذا جبر کوئی بھی ہو اسے ناپسند کیا جائے مگر یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں کے لیے فریڈم کا جبر قابل قبول ہے اسی لیے تو دو سال کے روتے ہوئے بچے کو بستر سے کھینچ کر مارتے پیٹتے ڈانٹتے ڈپٹتے چیختے چلاتے شور مچاتے ہوئے دھکے دے کر بغیر ناشتے کے ایک گاڑی میں جبراً بٹھا کر صبح سویرے قید خانے بھیج دیا جاتا ہے اور اس پر تمام

مہذب انسان فخر کرتے ہیں تاریخ کے کسی معاشرے میں ایسا بدترین جبر کبھی نہیں ہوا نہ مذہب کے دور میں نہ بادشاہت کے دور میں نہ فلاسفہ کے دور میں یہ سرمایہ داری کا جبر ہے جو آزادی کے نام پر نہ صرف مسلط ہوا بلکہ تہہ دل سے تمام اقوام عالم، ملتوں اور امتوں نے مشترکہ طور پر قبول کرلیا۔ اور اس کی مذہبی دلیلیں بھی ایجاد کرلی گئیں۔ لبرل ازم کے عقیدوں کے عین مطابق جو جبر انسان مرضی سے قبول کرلیتا ہے اسے لبرل ازم میں آزادی کہا جاتا ہے جو مرضی سے قبول نہیں کرتا اسے جبر کے ذریعے آزادی قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے یہ جبر لبرل ازم میں عین عدل کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی جبر کو اپنی مرضی اور آزادی سے لیکن تعقل مذہبی [Religious rationality] کی بنیاد پر قبول کرتا ہے تو ایسی آزادی کو لبرل ازم میں آزادی نہیں پابندی، جہالت، ضلالت، گمراہی اور بدترین ظلم قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جدید مغربی فلسفے (ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم) کے مطابق ہر عاقل انسان آزادی ہی پسند کرتا ہے۔ کسی قسم کی خارجی [External] پابندی پسند نہیں کرتا مذہب کی پابندیاں آسمان سے آتی ہیں اور انسانی آزادی میں کمی کردیتی ہیں۔ کانٹ نے انسان کی تعریف یہی کی ہے کہ جو کسی خارجی ذریعے سے وحی الٰہی سے، کسی عالم دین سے علم ہدایت روشنی نہیں لیتا تمام فیصلے عقلیت کی بنیاد پر کرتا ہے ہدایت کے لیے آسمان اپنے سے باہر، خارج کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ اپنے اندر جھانکتا اور عقل سے رجوع کرتا ہے کیونکہ انسان علم روشنی ہدایت میں خود کفیل ہے اسے کسی سے روشنی لینے کی ضرورت نہیں تفصیلات کے لیے انٹرنیٹ پر کانٹ کا مضمون What is enlightenment کا مطالعہ کیجیے۔ اور اس کی تشریح فوکالٹ کے قلم سے پڑھیے فوکالٹ کا مضمون What is enlightenment کے نام سے نیٹ پر موجود ہے۔

جدیدیت کا عقیدہ ہے آزادی کے عقیدے پر ایمان لاؤ کہ عقیدہ دلیل سے ماورا ہوتا ہے۔ Believe in Freedom اس بارے میں کسی سوال اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ جو اس کا انکار کرے گا اس کے خلاف NATO، UNO، USA سب مل کر حملہ کریں گے۔ آزادی take for granted ہے یہ بدیہی، آفاقی سچائی ہے اس کی کوئی عقلی دلیل نہیں یہ دلیل کا نہیں ایمان کا معاملہ ہے آزادی کے عقیدے پر سب کو ایمان لانا ہوگا۔ جو آزادی کے عقیدے کا انکار کرے گا اسے قتل کردیا جائے گا مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy جمہوریت کے ذریعے آزادی کے عقیدے کے تسلط کے لیے دنیا بھر میں ہونے والے جمہوری قتل عام کی داستان بیان کرتی ہے جمہوریت پرامن طریقے سے نہیں آئی یہ قتل عام کے بعد مسلط ہوئی ہے۔ اسی آزادی کے لیے امریکیوں نے دس کروڑ ریڈ انڈین کو قتل کیا تفصیلات اسی کتاب میں پڑھیے، ظاہر ہے جب جمہوریت کے تمام مخالفین کو قتل کردیا گیا تو دنیا پرامن ہوگئی لہٰذا اب جمہوریت پرامن طریقے سے آتی ہے اور دنیا کو بتایا جاتا ہے کہ

جمہوریت ہی پرامن تبدیلی کا واحد راستہ ہے الجزائر، ترکی، بنگلہ دیش، مصر ہر جگہ پرامن طریقے سے جمہوریت آ رہی ہے۔ جدید تعلیمی اداروں میں جمہوریت کی خونی تاریخ نہیں پڑھائی جاتی عالم اسلام میں جمہوریت کو اسلام سے برآمد کرلیا جاتا ہے حضرت ابوبکر پہلے جمہوری وزیراعظم ثابت کیے جاتے ہیں جبکہ اس جمہوریت میں نہ کسی کو الیکشن لڑنے کی اجازت تھی نہ الیکشن مہم چلانے کی نہ ووٹر لسٹ تھی نہ چیف الیکشن کمشنر۔ اس عظیم جمہوری۔ الیکشن کا نتیجہ ووٹنگ سے پہلے سنا دیا گیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہیں اور نتیجہ سنانے کے بعد سب بیعت کرنے یعنی ووٹ ڈالنے آ گئے اور کئی مہینوں تک بیعت کر کر کے ووٹ ڈالتے رہے ووٹ خفیہ ہوتا ہے یہ عجیب ووٹ ہے جو خفیہ نہیں اور ایک شخص کو حاکم منتخب کرنے کے بعد ڈلوایا جا رہا ہے اسلامی جمہوریت کی یہ شکلیں اسکولوں میں پڑھائی جا رہی ہیں۔

لبرل ازم کے عظیم سیاسی فلسفی جان رالز کا شارح Derben لکھتا ہے کہ جو شخص آزادی جمہوریت کی عقلی دلیل طلب کرتا ہے ایسے جاہل شخص کو کوئی جواب نہ دو اسے گولی مار دو ان موضوعات پر دلیل دینے کی بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سب الحق، الخیر، العلم ہیں یہ بدیہی حقیقتیں ہیں جو کسی دلیل کی محتاج [take for granted] نہیں۔ یہ self evident evedence ہیں۔

What Rawls is saying is that there is in a constitutional liberal democracy a tradition ofthought which it is our job to explore and see whether it can be made coherent and consistent... We are not arguing for such a society. We take for granted that today only a fool would not want to live in such a soceiety... If one cannot see the benefits of living in a liberal constitutional democracy, if one does not see the virtue of that .ideal, then I do not know how to convince him. To be perfectly blunt,sometimes I am asked,when I go around speaking for Rawls, What do you say to an Adolf Hitler? the answer is [nothing] You shoot him. You do not try to reason with him. Reason has no bearing on this question. So I do not want to discuss it (Derben, On Rawls & Political Liberalism, 2003: 328-329) (جاری ہے)

پاکستانیات چوہدری محمد یوسف ایڈووکیٹ ☆

# امن کی راہ پر......؟

ماہنامہ البرہان اور الشریعہ کے ساتھ میرا تعلق کافی پرانا ہے مگر یہ تعلق ہے بہت عجیب وغریب قسم کا۔ جناب مولانا زاہدالراشدی صاحب کو اپنے طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ میں نے ان کو اپنے استاد پروفیسروں کے ساتھ ایک ہی سٹیج پر بولتے ہوئے سنا اور دیکھا۔ میرے لئے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اس وقت خود دینی مدرسہ کے طالب علم تھے۔ پھر جن استاد پروفیسروں کے ساتھ وہ سٹیج پر بولتے تھے وہ کوئی معمولی لوگ تھے اور نہ ہی ان کا شمار ان پڑھ پروفیسروں میں ہوتا تھا۔ آج کے پی ایچ ڈی ان پڑھ پروفیسروں کو میں جانتا ہوں۔ ہمارے دوست توصیف احمد خان نے ایسے ہی ایک پروفیسر کو دیکھ کر کہا تھا کہ پی ایچ ڈی کا مطلب پھرا ہوا دماغ ہے۔ پھر یہ بات بھی دیکھی کہ مذاکرے کا عنوان بھی بڑا دقیق اور فلسفیانہ ہوتا تھا۔ گوجرانوالہ جو کہ پہلوانوں کا شہر ہے اس میں ذہنی کشتی کے اس سٹیج پر جناب زاہد صاحب کا اترنا ہی بڑی بات تھی۔ باقی ان کی تقاریر کے نقش میرے ذہن سے محو ہو گئے ہیں اس لئے ان کی تقاریر کے معیار پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جناب زاہد صاحب عمر میں مجھ سے تین سال چھوٹے ہیں۔ میں بڑا ہو کر بھی ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے ان کی بلندی کردار کا بھی عتراف ہے۔ جماعت اسلامی کی نانہجار قیادت نے مجھے جن صدمات سے دوچار کیا ہے میں شاید ان سے بچ نہ سکتا اگر مجھے زاہد صاحب کی دلجوئی حاصل نہ ہوتی۔ تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود جب الشریعہ میں مولانا زاہد صاحب کے ساتھ لفظ علامہ لکھا ہوا دیکھتا ہوں تو وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ دراصل اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ میں تو اقبال کے بعد کسی کو علامہ نہیں مانتا۔ لیکن دوسرے اس کے پابند تو نہیں۔ ہمارے ہی شہر میں کئی علامے ہوئے ہیں۔ ان میں یعقوب انور، احسان الٰہی ظہیر اور غلام رسول راشدی بھی تھے یا ہیں۔ بہر حال قدرت کا کھیل بھی کتنا عجیب ہے۔ جماعت اسلامی کی قیادت میری ہلکی پھلکی تنقید برداشت نہ کر سکی مگر الشریعہ کا حلقہ اپنے اوپر میری تنقید ہی برداشت نہیں کرتا بلکہ مجھے ہر طرح ایڈوانس کر رہا ہے۔ ایسے ہی ایام میں جناب جاوید غامدی صاحب کے حلقے سے تعارف ہوا۔ غامدی صاحب کی ایک مجلس میں جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب کے ساتھ میں بھی شریک ہوا۔ یہ شرکت ڈاکٹر محمد امین صاحب سے ملاقات تو نہ تھی مگر ان کو پہلی بار دیکھنے کا

---

کنوینر تحریک بغاوت گوجرانوالہ (موبائل: 0331-4602624)

موقعہ ملا۔ یہ موقعہ زیادہ اہم نہیں تھا مگر ان کے ساتھ کسی نہ کسی درجہ میں تعلق باقی ہے۔ ان کا ایک مضمون الشریعہ کے اپریل ۲۰۱۰ء کے شمارے میں چھپا۔ مضمون کا عنوان تھا ''ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت''۔ مجھے عنوان سے نقالی کا شائبہ محسوس ہوا۔ میرے ذہن میں سید مودودی کے ابتدائی مضمون ''ایک صالح جماعت کی ضرورت'' تھا۔ میں نے الشریعہ کے جولائی ۲۰۱۰ء کے شمارے میں ڈاکٹر امین صاحب کے مضمون کے حوالے سے ایک تندوتیز مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''ایک تحریک بغاوت کی ضرورت''۔ میرا مضمون کافی طویل تھا جس کا ایک حصہ ہی شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے مضمون کے جواب میں مزید صراحتوں پر مشتمل مضمون الشریعہ میں شائع کرایا جس کے بعد میں نے بحث کو مزید طول دینے سے گریز کیا۔ البتہ ڈاکٹر صاحب نے میرے نام البرہان اعزازی طور پر جاری کر دیا جو تا حال بلاتعطل جاری ہے۔ اعزازی پرچے پڑھنے کا جو چسکا مجھے ایک زمانے سے لگا ہوا ہے اسی کے تحت میں البرہان پڑھتا آ رہا ہوں۔ اس کے باوجود البرہان کے لئے کچھ بھی لکھنے پر طبیعت کبھی آمادہ نہ ہوئی۔ اس پر کئی بار ہلکی سی ندامت محسوس ہوئی۔ البرہان کے تازہ شمارے (جنوری ۲۰۱۵ء) میں انگریزی تہذیب کے اثرات سے ذیل میں ہمارے ہاں انگریزی زبان کے غلبے پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا گیا۔ ان کو پڑھ کر معاً میرا ذہن ہومیوطرز علاج کی طرف پلٹ گیا۔ اس طرز علاج کو نابغہ عالم جناب ڈاکٹر سیموئل ہانیمن نے دریافت کیا۔ توہین رسالت کے قانون کے احترام میں ہانیمن اعظم کو پیغامبر تو نہیں کہہ سکتا البتہ انہیں خدائے صحت کہنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ یہ جسارت اس لئے کر رہا ہوں کہ اردو ادب میں خدائے سخن کی ترکیب خوب مروج ہے۔ ہومیوطرز علاج کے موسس جناب ہانیمن نے دائمی امراض کے ذیل میں پہلا اصول یہ پیش کیا ہے کہ جب انسانی ذہن میں گناہ کا خیال پیدا ہوتا ہے تو دائمی امراض کی شروعات ہو جاتی ہیں۔ یہ اصول اتنا زبردست اور پاکیزہ ہے کہ کوئی پیغمبر ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ دائمی امراض کے علاج میں دوسرا اصول یہ ہے کہ ان امراض کا علاج تین نسلوں تک کرنا ہوگا۔

آج کل دینی مدارس میں پائے جانے والے امراض میں سے ایک مرض انگریزی زبان کی عدم تدریس تشخیص کیا جاتا ہے۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب کی روایت ہے کہ ان کے والدِ محترم جناب مولانا سرفراز صفدر صاحب جن کو وہ امام اہلِ سنت قرار دینے پر مصر ہیں۔ الشریعہ کی مجلس تحریر میں شامل ہونے کی وجہ سے میں اس اصرار کا موئید ہونے کا پابند تو نہیں۔ پھر مسئلہ امامِ اہلِ سنت کا ہے۔ زاہد صاحب تو جانتے ہیں کہ میں اہل سنت والجماعت میں سے نہیں ہوں۔ اہلِ حدیث ہوں۔ وہ بھی بے ایمان اہلِ حدیث۔ اب کوئی پوچھ سکتا ہے کہ بے ایمان اہلِ حدیث کون ہوتا ہے تو میں آسانی سے واضح کر سکتا ہوں کہ وہ خود قل خوانی نہیں کراتا مگر دوسروں کے قلوں میں شریک ہو کر خوانِ نعمت سے اپنے پیٹ کو خوب خوب بھرتا ہے۔ نماز میں ٹانگیں بھی پھیلانے اور آمین بالجیخ ہی سے نہیں بلکہ آمین بالجہر سے بچتا ہے۔ نماز ادا

کرے تو سر پرٹوپی یا رومال وغیرہ کو بدعت خیال کرے۔ گرمیوں میں لانگ نکر کوستر اور نماز کے لئے کافی سمجھے۔ بلکہ اسے مردہ سنت زندہ کرنے کی جزا میں سوشہیدوں کے درجے پر فائز ہونے کی ضمانت سمجھے۔

بات ہورہی تھی امام اہل سنت کی۔ زاہد صاحب کی روایت ہے کہ ان کے والد محترم ان کو ہمیشہ یہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ انگریزی زبان سیکھنی چاہیے۔ اس نصیحت پر امامِ اہل سنت نے خود عمل کیا اور نہ مولانا زاہد الراشدی صاحب ایسا کر سکے جیسا کہ علما کا شعار ہے۔ البتہ اس کا اثر تیسری نسل میں جا کر ہوا۔ میرا مطلب یہ کہ زاہد صاحب کے صاحب زادے عزیزم جناب عمار خان ناصر نے نہ صرف انگریزی میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی بلکہ انگریزی بولنے اور لکھنے پر کافی دسترس بھی حاصل کر لی ہے۔ میری خواہش تو ہے کہ وہ اردو کے بجائے انگریزی کو اظہار کے لئے مخصوص کر لیں تو دینی حلقوں کی نمائندگی کا وہ خلا جو انگریزی دان طبقے میں پایا جاتا ہے کم ہوسکتا ہے۔ بہر حال سیاق وسباق میں ''مزمن امراض کے علاج میں تین نسلوں تک'' کا اصول اپنا حوالہ ثابت کرتا ہے۔ جناب مولانا صفدر سے مولانا زاہد الراشدی اور عمار ناصر کی صورت میں اصول پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ دراصل تہذیبی اثرات ذہنی ہوں یا جسمانی، ان کا دورانیہ تین نسلوں کی صورت میں رواں دواں ہے۔ زبان کے مسئلے کو ہم سرِ دست ایک طرف رکھتے ہوئے مدارس سے متعلقہ ایک دیگر سلگتے ہوئے معاملے پر بات کریں گے۔ یہ معاملہ ہے دہشت گردی اور اس کے تدارک کا۔

پشاور میں آرمی پبلک سکول کے قتل عام کے سانحے کے بعد اس مرض کا علاج جنگی بنیادوں پر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ سانحہ کے بعد تو جیسے پوری قوم کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ گئی ہو۔ ہماری خوبصورت، نرم ونازک سول حکومت تو گویا حواس باختہ ہوگئی ہے۔ ہمارے وزیراعظم جو سورج اور چاند کی طرح دن رات مدور رہتے تھے وہ اپنے سارے دورے بھول بھال کے درپیش صورت حال میں قید ہو گئے ہیں۔ ہمارے آرمی چیف طبعًا فعال وسرگرم شخص ہیں۔ اتنا سرگرم وفعال آرمی چیف شائد ہماری قومی فوج کے حصے میں پہلے نہیں آیا۔ صورت حال میں پہلی دوسری اور تیسری اے پی سی ہوئی۔ ان سب میں آرمی چیف شریک ہوئے۔ ان کانفرنسوں میں آرمی چیف کی شرکت اس بات کی علامت ہے کہ ہماری سیاسی قیادت مکمل طور پر ناکام اور غیر متعلقہ ہوگئی ہے۔ یہ صورت حال پیدا ہونا تھی۔ طالبان کے ساتھ مذاکرات کے مرحلہ میں طالبان نے نواز لیگ، جماعت اسلامی اور تحریک انصاف پر اعتماد کا اظہار کیا۔ مولانا فضل الرحمان پر تو طالبان پہلے ہی اعتماد کرنے کو تیار نہ تھے۔ مذاکرات میں سیاسی قیادت صورت حال پر گرفت قائم نہ کرسکی۔ اس طرح فوج نے وزیرستان آپریشن شروع کر دیا۔ سیاسی حکومت کو کئی روز کے بعد آپریشن کی حمایت کرنا پڑی۔ اے پی سی میں سیاسی قیادت کا آرمی چیف کے ساتھ بار بار بیٹھنا آئین، قانون اور جمہوریت کا معمولی شعور رکھنے والے کے لئے زبردست شرم کا باعث ہے۔ پھر ہمارے آرمی چیف نے ہر صوبے میں جا کر ہر وزیر اعلیٰ کو کور کمانڈرز کی صحبت میں دے کر حالات کو ایک رخ دینے

کی جو کوشش کی ہے اس کے بارے میں ابھی سوال اٹھانے کا وقت نہیں کہ تمام سیاسی قیادت ہتھیار ڈال چکی ہے البتہ مولانا فضل الرحمان اس مرحلہ میں مذہبی قوتوں کو نشانہ بنانے کا حوالہ دے کر میدان میں اتر آئے ہیں۔ خیر سے اس ''جہادِ کبیر'' کی قیادت مولانا کے حصے میں آئی۔ ان کی روشن ضمیری کی داستانیں تو شہر کے در و دیوار پر موجود ہیں مگر میں کیا کروں کہ ان کے والدِ محترم نے پی این اے کی تحریک کو جس طرح سستا بیچا تھا، میں تو ابھی اسے بھی فراموش نہیں کر سکا۔ فوجی راج کے خلاف میرے جذبات تو لڑکپن سے ہی توانا ہیں۔ مگر مولانا فضل الرحمان کے اباجان نے تو ۱۹۶۲ء کے ایوب خانی دستور میں دوسری آئینی ترمیم کے بل کی تائید کی تھی۔ میرے نزدیک یہ ظلم ناقابل معافی تھا۔ دراصل انہوں نے اس ملک کے نظریاتی پس منظر کی تکفیر کو اپنا مسلک جانا تھا۔ اس ترمیم کی مولانا محمد ایوب خان ہزاروی کو ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب ان کے دل میں صدر ہوتے ہوئے دوبارہ صدارتی انتخاب لڑنے کی خواہش نے مچلنا شروع کیا۔ ۱۹۶۲ء کا دستور جو کسی اسمبلی کا منظور کردہ نہیں تھا بلکہ جنرل ایوب خان کے ذہن کی تخلیق تھا۔ دستور کے نفاذ کے وقت اس میں لکھا ہوا تھا کہ اگر صدارت کے منصب پر فائز شخص دوبارہ صدارت کا انتخاب لڑنا چاہے تو اسے انتخاب سے تین مہینے پہلے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کے سپرد کرنا ہوگا۔ صدارتی انتخاب کے لئے رائج نظام یہ تھا کہ ملک بھر سے اسی ہزار بی ڈی ممبرز یونین کونسل کی سطح سے منتخب کئے جاتے تھے۔ پھر یہ صدر منتخب کرتے تھے۔ ایوب خان کو اندیشہ ہوا کہ استعفیٰ دے کر وہ دوبارہ منتخب نہیں ہوں گے۔ چنانچہ آئین میں دوسری ترمیم لائی گئی۔ اس ترمیم کو منظور کرانے کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت تھی۔ صدر صاحب کی مسلم لیگ کو کنونشن مسلم لیگ کہا جاتا تھا۔ اس جماعت کو قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل نہیں تھی۔ دو تہائی کے حصول کے لئے آٹھ ووٹ کم تھے۔ چنانچہ ووٹوں کی اس کمی کو دور کرنے کے لئے یوں کہیں کے سیل لگائی گئی۔ افضل چیمہ کا ووٹ مل گیا۔ ان کو بعد میں صلہ کے طور پر ہائی کورٹ کی ججی بخش دی گئی۔ ووٹوں کی مزید تلاش میں مفتی محمود احمد صاحب بھی قابو آ گئے۔ ان کے ساتھ معاملات طے کرانے کی خدمت چوہدری ظہور الٰہی نے انجام دی۔ معاملہ بندی کا مقدس فریضہ خانہ کعبہ میں انجام پایا۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ طے کیا جائے اسے زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے۔ زر سودا پر روایات مختلف ہیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ جو کچھ بھی وصول ہوا وہ مفتی صاحب کی جیب میں نہیں گیا مدرسہ پر خرچ ہوا۔ بہر صورت سودا تو بہرحال سودا ہی ہے۔ ان کے صاحبزادے تو بہت آگے نکل چکے ہیں۔ ویسے بھی اب وقت اور زمانہ بھی تو کہیں آگے آ چکا ہے۔ اب تو منڈی میں خرید و فروخت کے انداز ہی بدلے گئے ہیں۔

ایسے میں مولوی سراج الحق جو دیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے انہیں دیروی لکھا جا سکتا ہے مگر اس سے ابہام پیدا ہوگا۔ ابہام کا مداوا خاص طور پر گوجرانوالہ میں بیٹھ کر ان کو سواتی لکھنے میں سہولت ہے۔ ویسے بھی سوات دیر سے زیادہ دور بھی نہیں۔ لہٰذا ہم ان کو سواتی ہی کے طور پر یاد کریں گے۔

اس طرح مولوی سراج الحق سواتی جرگہ کا لولی پاپ لے کر مے خواروں کی طرح پھرتے ہیں، یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ان کو کوئی پوچھتا تو ہے نہیں۔ آصف زرداری اور رحمان ملک نے ان کو خوب بے وقوف بنایا ہوا ہے۔ سید مودودی کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود وہ سوچ اور فکر سے خالی ہیں۔ سود کے فروغ میں وہ اعلیٰ خدمات انجام دینے سے ان کو ڈاکٹر مشتاق نے بچایا ہے۔ وگرنہ وہ آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ بیس نکات پر دستخط کناں ہونے کے بعد مکر گئے جیسے جنرل پرویز مشرف وردی اتارنے کا میڈیا پر کھلے عام اعلان کر کے پھر گئے تھے۔ جماعتِ اسلامی کی معلوم تاریخ میں پھر جانے کی روایت قاضی حسین احمد مرحوم نے قائم کی تھی۔ ایم ایم اے اور پرویز مشرف کی ٹیم کے ساتھ مذاکرات میں معاہدہ اور دستور کی ترمیمی مسودے پر دستخط کرنے کے بعد جب جناب اعتزاز احسن نے ایم ایم اے کو آڑے ہاتھوں لیا اور ایم ایم اے کو ملا ملٹری الائینس کا نام دیا تو قاضی حسین احمد بپھر گئے۔ اس مرحلہ میں ایس ایم ظفر نے حالات سنبھال لئے وگرنہ لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد نے تو ترازو میں رکھ کر ایم ایم اے کو بے وزن کر دیا تھا۔ ایس ایم ظفر نے ایم ایم اے کو اعتزاز احسن کے جبڑوں سے نکال کر زندہ رکھا۔

بہر حال وکلا طبقہ فوجی عدالتوں کو اپنی انیچ کی بنا پر کسی صورت قبول نہیں کر سکتا۔ یہ پاکستان ہے۔ جان کیری کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ افتخار چوہدری ابھی زندہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وکیل زندہ ہے۔ پاکستان کے دستوری ڈھانچے کے مسماران اولین، جسٹس محمد منیر اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مر چکے ہیں۔ نظریہ ضرورت گہرے طور پر دفن کیا جا چکا ہے۔ انشاءاللہ انشاءاللہ انشاءاللہ یہ کسی صورت زندہ نہیں ہوگا۔ پھونکنے والے کتنی ہی پھونکیں ماریں یہ زندہ نہیں ہوسکتا۔

فوجی کے ساتھ لفظ عدالت کی ترکیب لگانا ذہنی دیوالیہ پن سے کسی طرح کم نہیں۔ سابق چیف جسٹس جناب افتخار چوہدری نے لاہور میں وکلا سے مخاطب ہوکر نعرہ مستانہ لگا دیا ہے۔ اس تاریخی سفر کو جو مولوی تمیز الدین کیس سے شروع ہوا تھا اور عاصمہ جیلانی کیس سے ہوتے ہوئے نظریہ ضرورت کو دفن کرنے پر ختم ہوا تھا، جرنیل اسے پھر سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ شاید ہمارے بہادر جرنیل اس امر سے آگاہ نہیں کہ تاریخ کا عمل کبھی واپس نہیں ہوتا۔ قوم آرمی پبلک سکول کے واقعے سے جس ہیجان وطغیان میں مبتلا ہوئی ہے وہ بہت فطری ہے۔ اس طغیانی صورت حال میں ہوش مندانہ فیصلوں کی ضرورت ہے۔

سیاسی قیادت نے فوجی قیادت کے سامنے جس طرح سرنڈر کیا ہے وہ سیاسی شعور رکھنے والے ہر شخص کے لئے سخت پریشانی کا باعث ہے۔ یہ سرنڈر وکلا تحریک کے بعد، اس تحریک کا کریڈٹ کا کریڈٹ لینے والے لیڈروں کے لئے اتنا شرمناک ہے کہ جنرل نیازی اگر زندہ ہیں تو وہ خود اور مر گئے ہیں تو ان کی روح بھی شرمسار ہوگی۔ فوج کا اپنی حدود سے نکل کر نرم و نازک سول حکومت کا گلا دبا کر حالات کو ایک رخ دینے کی کوشش میں ملک کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ درست ہے کہ ہماری تاریخ میں سیاسی

قیادت نے اپنی نالائقیوں اور بدعنوانیوں سے فوجی قیادت کے لئے اقتدار پر فائز ہونے کی راہ ہموار کی۔ ہماری تاریخ کا سب سے پہلا بڑا مجرم تو قائداعظم علیہ الرحمہ کے دستِ راست لیاقت علی خان تھے۔ وہ سازشوں کے کتنے بڑے سلسلے کے بعد قائداعظم کے معتمد بنے۔ مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری کے لئے ملک غلام محمد مضبوط امیدوار تھے مگر جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والے لیاقت علی کو مسلم لیگ کی صفوں میں آگے آنے کا موقعہ مل کے رہا۔ وزارت عظمیٰ کو محفوظ بنانے کے لئے انہوں کس طریقے سے سید حسین شہید سہروردی کا پاکستان میں داخلہ روکا۔ تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ زیادہ تر مواقع پر شریف النفس لوگ ہی اپنے چہروں کو روسیاہی کا اعزاز بخشتے ہیں۔ آج کے نوجوان کو کیا خبر کہ خواجہ ناظم الدین نے سہروردی کا داخلہ بند کرنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔ کیا کوئی یقین کرسکتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین کو ایسا حکم جاری کرنے کی جرات ہوسکتی تھی۔ انہوں نے ایوب خان جیسے غیر ذمہ دار اور بدکردار شخص کو آرمی کا پہلا پاکستانی سربراہ بنایا۔ پھر ۱۹۴۹ء کی جنگ بندی کو قبول کر کے کشمیر کو بھارت کے لئے ہدیہ کیا۔ اس پر پائے جانے والے ہیجان کو ختم کرنے کے لئے راولپنڈی سازش کیس کا افسانہ تراشا گیا۔ اس افسانے کا سکرپٹ رائیٹر تو بہر صورت لیاقت علی خان اور ایوب خان کے سوا کون ہوسکتا ہے۔ تفصیلات دیکھنا ہوں تو کسی فٹ پاتھ سے ایوب خان کی لکھی ہوئی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' دیکھی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر اس کتاب کے ۳۵۔۴۰ صفحات بے حد چشم کشا ہیں۔ ایوب خان کے خلاف سب سے بڑی فرد جرم خود ان کی اپنی مرتب کرائی ہوئی یہ کتاب ہے۔ اس کے لئے اس کتاب پر ترجمان القران میں چھپنے والا تبصرہ بھی ایک زبردست حوالہ ہے۔ یہ تبصرہ گوجرانوالہ ہی کے ایک فرزند پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے سرکاری حلقوں کی فرمائش پر لکھا تھا۔ بات طویل ہوگئی ہے ہم واپس آتے ہوئے کہیں گے کہ اس ''ڈرامے'' کے نتیجے میں ان فوجی افسران کو راولپنڈی سازش کیس میں سزائیں دلوائی گئیں جنہوں نے کشمیر محاذ پر شاندار خدمات دی تھیں۔ لیاقت علی خان کے جھرلو پر تو اب تک لوگوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں مگر راولپنڈی سازش کیس کے مذموم ڈرامے پر جماعت اسلامی کی قیادت یہاں تک کہ سید مولانا مودودی علیہ الرحمہ کا انتہائی طاقتور قلم بھی سرنگوں ہوگیا۔ پھر جس طرح پنڈی سازش کیس کی سماعت کے لئے اس وقت کی مقنّنہ نے جو خصوصی قانون پاس کیا اسے برصغیر کی تاریخ کا سیاہ ترین قانون کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس قانون کی سیاہی کا کسی نے اندازہ کرنا ہو تو اس کا اردو متن گجرات یونیورسٹی کی شائع کردہ کتاب فیض احمد فیض کے صفحات ۲۲۳۔۲۲۹ قابل ملاحظہ ہیں۔ یہ ترجمہ بھی راقم کا مرتبہ ہے۔ یہ قانون اکیسویں آئینی ترمیم اور آرمی ایکٹ سے زیادہ کالا قانون نہیں تھا۔ ترجمان القرآن کے اشارات میں کانگریس، جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ پر جتنی بے رحم تنقید کی گئی یقیناً وہ تاریخ کے روشن باب کی حیثیت سے محفوظ ہوگئی ہے مگر اس کالے قانون پر اشارات میں ایک لفظ بھی نہ لکھا گیا۔ سید مودودی کی یہ مداہنت ان کے شانِ اعلیٰ سے

یکسر بے جوڑ ہے۔ لیاقت علی خان تو اپنی سازشوں کا شکار ہو کر ''شہید'' ہو گئے۔ مگر انہوں نے جو تحفہ ایوب خان کی شکل میں قوم کو مرحمت فرمایا، اس نے تو کمال ہی کر دیا۔ کوئی شک نہیں ہماری فوج دنیا کی بہترین فوج ہے۔ اس کا ڈسپلن ماتحتوں کی حد تک نمبر one ہے۔ لیکن یہ بھی ماننا چاہیے کہ اس کے بہت سے سربراہوں نے ہمیشہ ڈسپلن توڑ کر سول حکومت کو گھر بھیجا۔ چلیئے سیاستدانوں کی نااہلیوں اور بدعنوانیوں کی بنا پر فیڈرل اور سپریم کورٹ کی طرح ہم بھی ان کا یہ انڈسپلن معاف کر دیں مگر یہ تو پتہ چلے کہ ان فوجی حکمرانوں نے ملک کی کس قدر خدمت کی ہے۔ اگر کوئی خدمت فطری طور ہوئی ہو تو دوسری بات ہے۔ جیسے دس سال کا بچہ دس سال بعد بیس سال کا تو جائے گا۔ مگر اس میں بچے کا کوئی کمال نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایوب خان کے دور میں زراعت اور صنعت نے بہت ترقی کی۔ ترقی کے بارے میں اس زمانے میں ایک لطیفہ بہت مشہور ہوا تھا۔ ایوب خان عشرہ ترقی ہی منا رہے تھے۔ پاک بھارت سرحد پر دو کتوں کی ملاقات ہوئی۔ ایک کتا پاکستان کی غلام گردشوں سے پورے پروٹوکول کے ساتھ پہنچا تھا۔ دوسرا بھارت کے قصبے جاتی عمرا کی تنگ و تارک اور گندی گلیوں سے پیدل چل کر آیا تھا۔ پاکستانی کتا فوجی حکمرانوں کا پروردہ ہونے کے ناطے سے خوب موٹا تازہ تھا۔ جب کہ بھارت سے آنے والا کتا، بھوک اور افلاس سے مارا ہوا دبلا پتلا جیسے ٹی بی یا ہیپاٹائٹس کا مریض جو اپنی جملہ جمع پونجی اور جائداد ایلو پیتھک ٹیسٹوں کی نذر کر کے آیا ہو۔ ابتدائی خیر خیریت پوچھنے کے بعد دونوں نے اتفاق کر لیا کہ درمیانی لکیر غیر ضروری ہے۔ اسے مٹا دینے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ کتنا عرصے پہلے اکٹھے رہ چکے ہیں تو اب بھی یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔ اس ابتدائی ڈگری کے بعد کا مکمل مکالمہ درج کرنے کے بجائے چند ایک ڈائیلاگ پیش کرتے ہیں؛

پاکستانی کتا؛ بڑے بھائی! سوکھ گئے ہو، کھانے پینے کو نہیں ملتا؟

بھارتی کتا؛ ملتا تو ہے۔

پاکستانی کتا؛ پھر سوکھتے کیوں جا رہے ہو؟

بھارتی کتا؛ کئی ٹیسٹوں کے باوجود تشخیص نہیں ہو سکا۔ مگر تم بتاؤ تو سہی موٹے کیسے ہوئے جا رہے ہو؟

پاکستانی کتا؛ مال وافر ہے۔ حلال و حرام کی تمیز نہیں۔ کام کاج کی بھی ضرورت نہیں۔

بھارتی کتا؛ اچھا یہ بتاؤ کہ بھونکنے پر کوئی روک ٹوک ہے؟

پاکستانی کتا؛ ہر طرح کی موج ہے مگر بھونکنے اور رونے تو دور کی بات ہے، سسکنے بھی کوئی نہیں دیتا؟

بھارتی کتا؛ اس طرح تم گھٹ گھٹ کے مر نہیں جاؤ گے؟

پاکستانی کتا؛ اتنی موج ہے کہ موت کو بھول ہی گئے ہیں۔

بھارتی کتا؛ بھونکے بغیر کیسے وقت گزرتا ہے۔
پاکستانی کتا؛ آنکھیں اور کان بند رکھتے ہیں، سوچنے کا پہلے ہی کوئی مسئلہ نہیں۔
بھارتی کتا؛ بھونکنا فطری بات ہے؟
پاکستانی کتا؛ فطرت بھول بھی سکتی ہے۔ سچ پوچھو تو بھونکنا بھول گیا ہوں۔

طوالتِ اقتدار میں کچھ تو ہو ہی جاتا ہے مگر دریاؤں کی فروخت، ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن، مشرقی پاکستان کے دفاع کے لئے مغربی پاکستان میں جارحانہ پیش قدمی کی ناحکمتِ عملی، چین بھارت کے درمیان جنگ کے موقعہ پر چین کی جانب سے پاکستان کو کشمیر اچک لینے کا موقعہ فراہم کیا گیا مگر ایوب خان نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ اس سے بھی بڑھ کر اس بہادر فیلڈ مارشل نے اپنے ہی بنائے دستور کو توڑتے ہوئے اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کے حوالے کرنے کے بجائے جنرل آغا جنرل محمد یحییٰ خان کے سپرد کر دیا۔ ایوب خان نے سپرداری کا باقاعدہ خط لکھا جیسے راجے اور مہا راجے لکھا کرتے تھے۔ خط کے الفاظ نقل کرنے پر کورٹ مارشل ہو جائے گا لہٰذا مفہوم پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ کسی کو خط کے متن کو دیکھنے کی ضرورت ہو تو وہ عاصمہ جیلانی کیس کی کاروائی دیکھ لے۔ حضرت ایوب خان نے لکھا کہ ملک میں امن و امان کی خراب صورت حال میں میں پاکستان کی مسلح افواج کے سپہ سالار جناب جنرل آغا جنرل محمد یحییٰ خان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ ملک کی باگ ڈور سنبھال کر اپنی آئینی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ سپریم کورٹ میں جب یہ خط زیر بحث آیا تو چیف جسٹس حمود الرحمان (جن کے بلند اقبال فرزند اقبال حمید الرحمان شاید سپریم کورٹ کے جج ہیں) اور ان کے ساتھی بار بار کہتے تھے کہ سرکار کے نمائندے واضح کریں کہ ان حالات میں جنرل یحییٰ پر کون سی آئینی ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں۔ یہ ذمہ داراں کہاں لکھی ہوئی ہیں۔ عدالت کو دکھائی جائیں۔ دستور تاج شاہی کی طرح بار بار اچھالا جاتا تھا۔ مگر جب تاج اچھالے جائیں تو پھر فوجی آمر خود اپنے دستور کو بھی فنا کرنے پر اتر آتے ہیں۔

اس اقدام سے پہلے ایوب خان کا یحییٰ خان جیسے بلانوش کو آرمی چیف مقرر کرنا اس مملکت خدا داد پر کتنا بڑا احسان ہے، اپنی ہی سرزمین کو کلیر کرنے سے پہلے جناب راحیل شریف جواب دے دیں تو مہربانی ہوگی، جواب نہیں دیں گے تو بھی مہربانی ہوگی۔

اسی طرح جنرل پرویز مشرف کا افغانستان پر امریکی حملے سے پہلے یوٹرن جیسے بڑے بڑے کئی معاملات میں ہمارا مستقبل ذبح ہو چکا ہے۔ ہم اسے اپنی تقدیر کے طور پر قبول کر رہے ہیں۔ مگر یہ بھی تقدیر کا فیصلہ ہے کہ افغان اپنی دھرتی کا دفاع کرنا جانتے ہیں۔ روس کے بعد امریکہ بھی افغانستان سے رسوا ہو کر نکل رہا ہے مگر جاتے جاتے وہ افغانوں سے لڑنے کا چارج ہمیں دینا چاہتا ہے جسے ہم نے نہ چاہتے ہوئے بھی بالآخر قبول کر لیا ہے۔ وزیرستان آپریشن کے موقعہ پر البرہان میں ڈاکٹر محمد امین نے

بہت خوبصورت تبصرہ لکھا۔ان کا تبصرہ بہت مختصر مگر جامع ہے۔ان کے مطابق یہ آپریشن امریکہ کی خواہش تھی جو پوری ہوگئی ہے۔اس طرح امریکہ کامیاب ہوا ہے۔باقی سب ناکام ہوئے ہیں۔

اس آپریشن میں شدت پشاور میں آرمی پبلک سکول پر حملے کے سانحہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ شدت کی یہ کیفیت نوگیارہ کے امریکی ٹاورز پر خودساختہ و پرداختہ حملوں کے بعد جیسی ہے۔ ہماری پوری سیاسی قیادت جو پہلے آپریشن کی حمایت بڑی کم دلانہ طور پر کررہی تھی اب بالکل ڈھیر ہوگئی ہے۔تمام فیصلے فوجی قیادت کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں۔آل پارٹیز کانفرنسوں میں متفقہ ایجنڈا منظور کروانے کے بعد آئین اور قانون میں ترمیم ہوگئی ہے۔فوجی عدالتوں کے قیام کو آئینی cover دینے کا اقدام بظاہر پورا کرلیا گیا ہے۔دہشت گردی کے ایکشن پلان پر عمل درآمد کے لئے راحیل شریف صاحب رحیل ہوچکے ہیں۔دودن کے اندر انہوں نے علاقائی کورکمانڈروں کو ساتھ لے کر چاروں وزرائے اعلیٰ سے ملاقات کی ہے۔اس صحبتِ خالصہ کے نتیجہ میں وزرائے اعلیٰ فوجی آپریشن اورفوجی عدالتوں کی تسبیح فرمانے لگے ہیں۔

دستور کی ترمیم کے نام پر اس کی مکمل پائمالی اختیار کرلی گئی ہے۔اس میں وکلاتحریک کے سب سے بڑے ہیرو بھی شامل ہوگئے ہیں۔انہوں نے بھی تمام شہری حقوق سرنڈر کردئے ہیں۔''ریاست ہوگی ماں کے جیسی'' کا گیت گانے والے فوجی عدالتوں کے قیام میں ممدومعاون ہوگئے ہیں۔اگر اسے سرنڈر کہا جائے تو جناب اعتزاز احسن کا یہ سرنڈر جنرل نیازی کے سرنڈر سے کم شرمناک ہے یا زیادہ؟ یہ طے طلب ہے۔البتہ پارلیمنٹ میں طویل عرصہ تک انتہائی مثبت کردار ادا کرنے والے سینیٹر رضاربانی کا رودھوکر یہ اعلان کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ووٹ دے رہے ہیں۔بے ضمیری کے اس مظاہرے کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ووٹ پارٹی کی امانت ہے۔انہوں نے یہ امانت پارٹی کو لوٹا دی ہے۔آئندہ کا لائحہ عمل خود بنائیں گے۔ایسی امانت اور ایسی بے ضمیری پر تین حرف بھیجے جائیں یا تحسین کی جائے میری سمجھ سے باہر ہے۔مگر یہ رونا صرف رضاربانی صاحب کا نہیں پوری پارلیمنٹ کا ہے۔آج کی پارلیمنٹ کا ہی نہیں اولین دستور یہ کا بھی۔حالانکہ اس دستور یہ میں بہت بڑے بڑے لوگ شامل تھے۔وہ سب لائق احترام ہیں مگر دستور یہ اور مقنّنہ کی کارکردگی مائنس زیروزیروزیرو۔۔۔۔سے کم ہوگی زیادہ نہیں ہوسکتی۔ایک لے دے کے قرارداد مقاصد کی چند سطور کو کوئی کیا کرے گا۔یہ قرارداد، لاوارثوں کی طرح کبھی دستور کا دیباچہ بنتی ہے اور کبھی دستور کے اندر 2-A کی صورت میں گھسیڑ دی جاتی ہے جسے جسٹس نسیم حسن جیسا چمک کا دلدادہ دستور سے نکال کر شاہراہ دستور پر پھینک دیتا ہے۔

اس طویل مخدوش صورت حال میں جناب افتخار چوہدری نے ایک بار پھر اپنا افتخار قائم رکھا ہے۔انہوں نے واضح کردیا ہے کہ فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے دستور میں ترمیم بھی گئی تو وہ دستور کے بنیادی ڈھانچے سے متصادم ہونے کی بنا پر غیر آئینی ہوگی۔میڈیا کے زور پر صورت حال میں فوجی

عدالتوں کے قیام کو اضطرار ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ہمیں ۱۹۵۴ء کے زمانے میں واپس لیجانے کی کوشش ہورہی ہے۔جسٹس منیر کو دوبارہ زندہ کیا جارہا ہے۔کیا افتخار چوہدری کے ہوتے ہوئے یہ ہوسکے گا؟اس کا فیصلہ وقت کردے گا۔مگر یہ حقیقت ہے کہ فیصلہ کن جنگ شروع ہوچکی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ آرمی پبلک سکول کے بچوں کے قتل عام پر مولانا سمیع الحق اور مولانا عبدالعزیز غازی نے آنسو نہ بہائے ہوں۔اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ لال مسجد کے آپریشن میں ''ہلاک'' ہونے والے بچوں پر آنسو بہا بہا کر ان کی آنکھیں خشک ہوگئی ہوں۔عبدالرشید غازی اور مولانا عبدالعزیز کی معذور والدہ اپنے بیٹے کے ساتھ ''ہلاک'' ہوئی اور اس کی لاش بھی کہیں نہ ملی۔اس آپریشن کے نتیجہ میں غائب ہونے والی بچیوں کا آج تک سراغ نہیں ملا۔اسی طرح باجوڑ کے ڈرون حملے میں اسی بچے ہلاک ہوئے تو ان کے ٹکڑے جمع کر کے سراج الحق سواتی نے جنازہ پڑھایا تھا۔ان کو شہید کیسے کہا جائے کہ ڈرون طیارے تو اب تقدس پاچکے ہیں۔ان کو ہماری بہادر فوج گرا سکتی ہے اور نہ ہی اس پر کوئی سنجیدہ احتجاج کیا جاتا ہے۔بات لمبی کرنے کے بجائے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آمنہ مسعود جنجوعہ سے کون جا کر کہے گا کہ ہماری ایجنسیوں نے جن ہزاروں بچوں، بوڑھوں جوانوں اور عورتوں تک کو اٹھا کر غائب کر کے جس ستم سے دوچار کیا ہے وہ ان پر رونے دھونے کا سلسلہ بند کیوں نہیں کرتی۔''ضرب عضب'' کی کامیابی کے پس منظر میں گم اور غائب کردہ افراد کے مسئلے کو ذہن سے نکال دینا ہوگا۔اس رونے دھونے کو اب جرم قرار دے دیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔جسٹس افتخار چودھری تو عدم پتہ افراد کے معاملات ایک انکوائری کمیشن کے سپرد کر کے خود ریٹائر ہوگئے ہیں۔منیر اے ملک بھی اسی مسئلے پر احتجاج کے طور پر اٹارنی جنرل کے عہدے سے مستعفی ہوگئے ہیں۔انہوں نے اپنے ضمیر اور کردار کو بچا لیا۔چلیے یہ ہوگیا۔مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ سال ہا سال سے عدم پتہ لوگوں کی ماؤں کا منہ بند کرنے کا بھی کوئی نسخہ تیار ہونا چاہیے۔میرا ''خیال'' ہے کہ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ آمنہ مسعود جنجوعہ کو کم از کم منظر سے غائب کردیا جائے۔ویسے تو عملاً یہ ہوگیا ہے۔میڈیا پر اب ان کا کوئی تذکرہ نہیں۔کمیشن اپنا کام خوب کررہا ہے مگر کہاں تک؟ سیاسی جماعتوں کے ہاں اس مسئلے کو رسمی طور پر زیر بحث نہیں لایا جاتا۔آرمی پبلک سکول کے معصوم اور پیارے بچوں کی عظیم قربانی،مگر بچے تو معصوم ہیں۔ان بے چاروں وہ تو بلاعلمی میں مارے گئے ہیں۔قربانی تو ان بچوں کے والدین کی ہے۔والدین کے جذبات کے احترام لازم ہے۔اس احترام کو تقاض ہے کہ کم از وقتی طور پر ہمیں عافیہ صدیقی کو بھی بھلا دینے میں کوئی مشکل نہیں آئے گی۔عافیہ کی سزا پر نوحہ لکھنے والے شاعر کا نام بشیر ناصر ہے۔اسے کون جانتا ہے۔اس کے نوحے کو کون سنے گا۔پھر بھی اس نوحے کو مذاق کے طور پر دیکھ تو لیں۔

میرے منصف نے عجب فیصلہ لکھا ہے مرا
ایک میں ہی نہیں، حیران زمانہ ہے مرا

شہر والو! مجھے حیرت سے نہ دیکھو ایسے
یہ مرے اشک نہیں، خونِ تمنا ہے مرا

روح یہ پوچھتی پھرتی ہے گلی کوچوں میں
مجھ کو بتلاؤ! بدن کتنے میں بیچا ہے مرا؟

دیکھتی رہتی ہوں، بیٹھی درو دیوارِ قفس
دل رہا ہونے کی امید پہ ہنستا ہے مرا

آج بھی قفل پڑا ہے، درِ زنداں پہ وہی
آج بھی دل، کسی آہٹ کو ترستا ہے مرا

موج در موج مری پیاس بڑھی جاتی ہے
یہ الگ بات، مری آنکھ میں دریا ہے مرا

ہیں میرے اہلِ وطن میرے لئے محوِ دعا
کس بلندی پہ، مقدر کا ستارہ ہے مرا

سرخ رو ہو کے کبھی، اپنے وطن آؤں گی
میں سچائی ہوں، مرے ساتھ زمانہ ہے مرا

یہ نوحہ تو بھولا بھلایا ہے۔

ہم دیکھیں گے کون نام لے گا مشرف کی جانب سے اپنی قوم کی ماؤں بیٹیوں اور بیٹوں کے پیسے کمانے کا۔ حبہ بڑی سادہ ہے؛

اب انصاف پھانسی کے پھندے کے ساتھ ہوگا۔ محبت کی فصل گولیوں سے بوئی جائے گی۔ فوجی عدالتیں ضیاء الحق کے doctrine of ready justice کے تحت قائم کی جا رہی ہیں۔ اس میں فیصلے برق رفتاری سے ہوں گے۔ انصاف لینے کے لئے آپ کو کہیں جانا نہیں پڑے گا۔ یہ آپ کے گھر میں گھس جائے گا۔ کسی کو پلک جھپکنے کا موقعہ بھی نہیں ملے گا۔ وکیل ہوگا اور نہ ہی اپیل کا حق۔ سماعت ایک رسم ہوگی اور فیصلہ اوپر والوں کے مطابق۔ تا کہ جب اپیل اوپر جائے تو فیصلہ میں کوئی مشکل نہ ہو۔ آرمی میں ڈسپلن اسی کو کہتے ہیں۔ سعودی عرب کا معاشرہ فوری انصاف کی وجہ سے crime less ہے۔ اس پر عالمین گواہ ہیں۔ اس انتظام کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وکلا آئے روز، وجہ اور وجہ کے بغیر، ہڑتال کے لئے آزاد ہو جائیں گے۔ اس آزادی کے ساتھ وکلا کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فریق مقدمہ پیشی

معلوم کر ہی لے گا۔ وکیل صاحب کی ٹھگی بدستور رہے گی۔ انصاف کی گاڑی بلٹ ٹرین کی رفتار سے چلے گی، خواہ نیچے پٹڑی بوسیدہ ہی کیوں نہ ہو۔

دنوں کی بات ہے کہ ہر سو ایسے انصاف کا دور دورہ ہو جائے گا۔

فوجی عدالتوں کے قیام کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ موجودہ خصوصی عدالتیں دہشت گردی کے کیسوں میں انصاف نہیں کر سکیں۔ کیا یہ سوال اٹھانے کی اجازت ہوگی کہ جن کیسوں میں عدالتوں نے سزائے موت سنائی اس پر عمل درآمد کیوں نہ ہونے دیا گیا۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کوتاہی کے ذمہ دار وزرائے اعظم اور وزرائے اعلیٰ اور وزرائے داخلہ و دیگران کو فوجی عدالتوں میں پیش کیا جائے اور ان سب کو ایک ہی روز لٹکا دیا جائے تو دہشت گردی ختم ہو جائے گی۔ سزا کے بعد عدالتی احکامات پر عملدرآمد نہ کرنا دستور پاکستان کی واضح خلاف ورزی ہے۔ وفاقی وزیر داخلہ نے ۱۰ جنوری ۲۰۱۵ء کو یہ بیان جاری فرمایا ہے کہ فوجی عدالتیں آئین سے انحراف کرنے والوں کے لئے ہیں۔ اس انحراف میں تو خود وفاقی وزیر صاحب بھی آتے ہیں۔ بسم اللہ کیجئے۔ ایسا انصاف ہو جائے تو دہشت گردی کا بیج بھی باقی نہیں رہے گا۔ اگر پھر بھی دہشت گردی باقی رہی تو میں سزا کے طور پر لٹکنے کو تیار ہوں گا۔

اس اہتمامِ خشک و تر کے بعد دیکھیں گے کون نام لیتا ہے عافیہ صدیقی اور اس کی اسی سالہ قید اور قید سے رہائی کا۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ ایسے ہر مسئلے پر مٹی ڈالنے کا عمل شروع ہی نہیں بلکہ مکمل ہو چکا ہے۔ یہ آپریشن مکمل ہو کر رہے گا۔ عدم پتہ لوگوں کو سب بھول چکے ہیں۔ ان کے قصے اور کہانیاں افتخار چوہدری چرا لے گئے ہیں۔ اب کسے ضرورت ہوگی ان کے ذکر کی۔ اب صرف فوجی جوانوں کے بچوں کا ماتم ہوگا۔ وہی شہید ہونے کے اعزاز رکھتے ہیں۔ ڈرون اور پاک فضائیہ کے طیاروں پر بچوں اور عورتوں کو شناخت کرنے کے لئے detectors لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اب ایسے حملوں میں ہلاک ہونے والے بچوں اور عورتوں کا واویلا کرنے والوں کو آہنی ہاتھوں سے نپٹا جائے گا۔ ان کو کسی نے شہید کہنا چاہا تو ایسوں کا نام و نشان بھی نہ ہوگا اور

کون کہے گا حق کی داستاں جب ہم نہیں ہوں گے

وجہ یہ ہے کہ اب سب ایک ہی page پر ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک page کے سوا اگر باقی ساری کتاب غائب ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ قوم میں راحیل شریف کی زبردست قیادت نے اعتماد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ یہ وہ کام ہے جو برسوں بلکہ عشروں میں سیاسی اور دینی قیادت نہیں کر سکی۔ انشاء اللہ ان کو زندگی ہی میں نشان حیدر اور نشان پاکستان کے اعزازات سے نوازا جائے گا۔ وکلا اور عدلیہ اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ وہ چاند سے آئے ہیں۔ فوج بھی ہماری قومی فوج ہے۔ ماضی میں ہر سطح پر غلطیاں ہوئی ہیں۔ سیاستدان اور جرنیل میں سے کوئی بھی معصوم نہیں۔ دراصل

قیادت کی تشکیل کے عمل صدیوں میں پورا ہوتا ہے۔ دیدہ ور روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ جیسے بلند قامت شخصیت کی عطا روزمرہ نہیں۔ ہم میں بعض کی تنگ نظری ہر بالشتیے کو بڑی قامت دے سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اپنی ہے۔ اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اپنی بے نوری پر ہزاروں سال رونے کے بعد کہیں مشکل ہی سے دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ ایک روایت بھی ہے کہ ہر صدی کے بعد ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ مجدد کون ہوتا ہے جو فکری جمود اور حمود میں زلزلہ پیدا کر کے اس میں سے جہانِ تازہ پیدا کرے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ قومیں صدیوں میں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ تعمیر و تخریب کے اس عمل میں اگر سمت درست رہے تو پھر بلندی کی جانب سفر جاری رہتا ہے۔ اقبال تو منزل کا قائل نہیں ہر منزل کے بعد نئے سفر پر گامزن ہونے کو لازمہ حیات سمجھتا ہے۔ صبح و شام چلنا اور مدام چلنا، یہی ہے رختِ سفر۔

آخر پر درپیش صورت حال پر ایک سوال اور مشورہ، سوال کس سے اور مشورہ کس کے لئے، معلوم نہیں، شائد اپنے سے اور اپنے لئے ہی۔ اسے ہی خود کلامی کہتے ہیں۔ سنا ہے خود کلامی میں شدت آ جائے تو پاگل پن کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ پر ہول ماحول میں یہ سکون کا ذریعہ ہوتا ہے، مگر میں تو سکون کا متلاشی نہیں رہا۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے اور ہر ایک کو اس کی مراد تک پہنچائے، یہ اس کا وعدہ ہے اور یقیناً وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں جاتا۔

آرمی سکول پر حملہ کے بعد صرف غیر محفوظ آرمی سکولوں کی سیکورٹی کی ضرورت تھی۔ مگر خوف کی مریض حکومت نے ملک بھر کے سکولوں کی سیکورٹی کا مسئلہ بنا کر دہشت پھیلا دی ہے۔ اس طرح دہشت گردی کا خاتمہ ہوگا؟؟؟؟ دہشت گردی کا خوف پھیلانے کے بجائے بہادری سے اسے فیس کیا جانا چاہیے۔ وگرنہ؟؟؟؟ امن و سلامتی کی ایک ہی صورت ہے کہ قانون سب کے لئے ایک جیسا ہو۔ پروٹوکول کسی کے لئے بھی نہ ہو۔ صدر سے لے کر ایس ایچ او تک، سب کو پروٹوکول ختم کر دیا جائے۔ ہم فاروقِ اعظم کی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ چشم فلک نے حضرت عمرِ فاروق کو ایک لمحہ کے لئے بھی پروٹوکول کے حصار میں دیکھا ہے۔ لہٰذا منافقت ترک کی جائے اور ہر کوئی عام عام آدمی کی طرح رہے۔ کوتاہی جو بھی کرے اس کو قرار واقعی سزا ملے۔ جتنا کوئی ذمہ دار ہوئے اتنا ہی اسے سزاوار ٹھہرایا جائے۔ کسی درجے میں رعایت کا امکان ہے تو صرف کمزور و مجبور کے لئے۔ طاقت ور کے لئے رعایت کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا۔ امن قائم کرنا ہے تو سوسائیٹی کو اسلحہ سے پاک کر دیا جائے۔ سعودی عرب میں سپاہی کے پاس بس ایک چھڑی ہوتی ہے۔ یہ چھڑی بے لاگ، درست اور سچی تفتیش کی علامت ہے۔ یہ انصاف کے ترازو کو قائم رکھنے میں عدالت کی مددگار ہوتی ہے۔ جس معاشرے میں انصاف ہوگا وہاں خوف، غم اور دہشت کا بیج پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر اس کے برعکس صورت پر اصرار کیا گیا تو پھر کیا ہوگا؟ مایوسی، مایوسی اور مایوسی، مگر ہم اس جانب کیوں جائیں۔ ہمارا عزم امن اور انصاف ہی ہوسکتا ہے۔

پاکستانیات

پروفیسر ملک محمد حسین ☆

# پاکستان میں دہشت گردی کے اسباب

## مدیر البرہان کے سوال کے جواب میں

دہشت گرد (Terrorist) اور دہشت گردی (Terrorism) زمانہ حال کا ایک اہم لیکن تکلیف دہ معاملہ (Phenomenon) بن گیا ہے۔ مدیر البرہان نے البرہان کے دسمبر 2014ء کے شمارے میں اس سلسلہ میں سوال اُٹھایا ہے کہ کوئی دہشت گرد کیوں ہوتا ہے اور وہ دہشت گرد کیوں بنتا ہے نیز دہشت گرد بن کر وہ آرمی پبلک سکول کے معصوم بچوں پر حملہ کرنے جیسے قبیح جرم کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟ ہم سطورِ ذیل میں ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

ہماری نظر میں دہشت گرد ہونا ایک طرح کی نفسیاتی کیفیت ہے جس کے پیدا ہونے کی وجوہات مذہبی، سماجی یا معاشی ہوسکتی ہیں۔ یہ غصے اور مایوسی کی ملی جُلی کیفیت کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے۔ یہ اُس برین واشنگ کی پیداوار بھی ہوسکتی ہے جس میں فرد کو ظلم وشقاوت کے مناظر دکھا کر اور انتقام کی طرف مائل کر کے ایسا کچھ کرنے پر اُبھارا گیا ہوتا ہے جو ہم جیسے عام لوگوں کی نظر میں تو دہشت گردی ہوتی ہے لیکن ایسا کچھ کرنے والے کے لیے اُخروی زندگی میں فوری کامیابی کا باعث کہ اُسے خواب وخیال میں جنت کے نظارے نظر آ رہے ہوتے ہیں یا انتقام کی آگ ٹھنڈی ہونے سے اُسے سکون ملتا نظر آتا ہے۔

دہشت گردی کی نفسیاتی کیفیت کی ایک حالت کو بلی کی اُس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ بلی کو اگر بند کمرے میں مارنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لیے کوئی جائے فرار نہ چھوڑی جائے تو وہ غضبناک ہوکر اُس انسان کی جان لے سکتی ہے جس نے اُسے اس کیفیت میں لا کھڑا کیا ہے۔ ہمارے علاقہ خوشاب، چکوال، میانوالی کی متعدد مثالیں ہیں جن میں اچھا بھلا شریف اور نارمل انسان حالات کے جبر کی وجہ سے ڈاکو یعنی دہشت گرد بن گیا۔ محمد خان ڈھرنالیا اور چراغ بالی ماضیِ قریب کے دہشت گردی کے وہ کردار ہیں جو ایک طرف انتقام اور دوسری طرف فرار کے سارے راستے مسدود پا کر علاقے کے لیے دہشت کی علامت بن گئے۔

اس وقت دہشت گردی کے جس مسئلہ سے ہم دوچار ہیں اس کی اساسی وجوہات میں مذہب

---

☆ ڈائریکٹر الفوز انٹرنیشنل گرلز کالج جوہر آباد (خوشاب)

کا عنصر بھی ہے، انتقام کا جذبہ بھی کارفرما ہے اور معاشی تنگ دستی بھی کسی حد تک اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ دو نوجوانوں نے فرانس میں چارلی ہیڈو میگزین کی آزادیٔ رائے کے احمقانہ تصور سے پیدا ہونے والی ابلاغی دہشت گردی کے نتیجہ میں حملہ کر کے 12 افراد مار ڈالے اور خود بھی لقمۂ اجل بن گئے۔ مذکورہ دونو جوانوں کے عمل کو اگر دہشت گردی کہا جائے تو یہ "دہشت گردی" مذہبی غیرت، مایوسی اور انتقام کی ملی جلی کیفیت کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ دنیا کی نظروں میں شاید یہ بات درست نہ ہو لیکن ایسا سوچا تو جا سکتا ہے کہ اگر چارلی ایبڈو کے مدیر کو گستاخانہ خاکے شائع کرنے کی آزادی کا حق حاصل ہے تو وہ جن کے جذبات کو ان خاکوں سے ٹھیس پہنچی ہے انہیں وہ ردِعمل دکھانے کا حق بھی حاصل ہے جو دونو جوانوں نے چارلی ایبڈو پر حملہ کر کے دکھایا۔ چارلی ایبڈو کا مسئلہ تو یونہی درمیان میں ٹپک پڑا۔ ہم اُس دہشت گردی کی بات کرتے ہیں جس سے ہم پاکستان میں یا اسلامی دنیا میں دوچار ہیں۔ ہمارے ہاں دہشت گردی کی موجودہ شکل کا آغاز افغانستان پر روس کے حملہ سے ہوتا ہے اور اُس میں نیا رُخ افغانستان پر امریکہ کے حملہ سے آیا ہے۔ امریکہ کی عالمی چودھراہٹ، امریکہ کے حلیف ممالک کی احمقانہ بین الاقوامی پالیسیاں، مسلم ممالک کے حکمرانوں کا کٹھ پتلی بن کر اپنے عوام کی خواہشات اور جذبات کے برعکس اقدامات، گلوبلائزیشن اور کارپوریٹ معاشی کلچر کی ظالمانہ کارروائیاں جن سے عوامی غربت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور ایک چھوٹی سی اقلیت سرمایہ سمیٹ کر پھولتی جارہی ہے۔ یہ سب وہ عوامل ہیں جو دہشت گردی کو ایندھن فراہم کرتے ہیں۔ فرقہ واریت اور نچلی سطح کے مذہبی کارکنوں کی معاشی مجبوریاں انتہا پسندی کا رجحان پیدا کرتی ہیں۔ ڈرون حملوں اور مسلح تصادموں سے جو عام اور معصوم شہریوں کا مالی اور جانی نقصان ہوتا ہے اُس سے مایوسی اور انتقام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جنہیں شیطانی ذہن کے لوگ مذہبی تصورات کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہوئے نوجوانوں کی برین واشنگ کرتے ہیں اور اس طرح دہشت گردی کے لیے ایندھن فراہم ہوتا ہے۔ غربت، معاشی ناہمواری، سماجی ظلم، احساسِ محرومی اور اسی طرح کے دیگر لوازمات دہشت گردانہ ذہنیت کی پرورش کا باعث بنتے ہیں۔ پچھلے دنوں کسی کالم نگار نے اپنے کالم میں پشاور کی روح فرسا دہشت گردی کو بقول طالبان کے کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ کی دلیل دیتے ہوئے بچے کے بدے بچہ کے احمقانہ اور سوقیانہ تصور کا ذکر کیا تھا۔

پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ بہت حساس ہے جسے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں نے اور حساس اور بھڑکنے والا (Volatile) بنا دیا ہے۔ دوسری طرف یہی سیاستدان اور مذہبی رہنما قیادت پر فائز ہو کر اور حکومت پر قبضہ کر کے عوامی جذبات اور ضروریات کے معاملے میں بالکل بے حس ہو جاتے ہیں اخبارات، ٹی وی چینلز، اینکر پرسنز اور تجزیہ کار عوامی جذبات خواہشات اور احساسات کو کانٹے چھونے

اور اُن کے رِستے زخم کریدنے میں جس سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اُس سے لامحالہ انتہا پسندی پیدا ہوتی ہے جسے تھوڑی سی محنت کر کے دہشت گردی میں ڈھالا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں دہشت گردی کی کارروائیوں کو دشمن کی سازشوں کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم خود ہی اپنے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اکثر ہمارا اپنا اور اپنوں کا کیا دھرا ہی ہوتا ہے۔ دشمن تو بہرحال دشمن ہے اُس نے تو دشمنانہ کارروائیاں کرنا ہی ہوتی ہیں لیکن دشمن کو مواقع اور دہشت گردی کا ساز و سامان ہم خود مہیا کرتے ہیں۔

مدیر البرہان نے سابقہ شمارے میں دہشت گردی کے متعلق جو سوالات اُٹھائے تھے ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ اُن کے جوابات دیئے جائیں۔ سطورِ بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا اُسے دوبارہ پڑھنے کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ ہم مدیر البرہان کے سوالات کا جواب نہیں دے سکے بلکہ شاید اس سلسلہ میں کنفیوژن کچھ بڑھا دی ہے۔ ہم نے دوبارہ اپنی سوچ اور ذہنی حالت پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ ہم مدیر البرہان کے اُٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات دے سکتے تھے لیکن حقیقت بیان کے راستے میں خوف اور ناامیدی حائل رہی۔ یہ خوف بین الاقوامی حالات کا پیدا کردہ بھی ہے اور مقامی حالات کا پیدا کردہ بھی۔ اس خوف کی جڑیں معاشرے کی انتشار زدہ کیفیت میں بھی پیوست ہیں اور خود ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ بھی۔ ہم سب جب تک منافقت نہیں چھوڑتے اور سچ بولنا شروع نہیں کر دیتے معاملات جوں کے توں رہیں گے۔ آخر میں ہم دہشت گردی کی بیخ کنی کے لیے کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں کہ شاید اُن سے مدیر البرہان کے سوالات کے جوابات اخذ کیے جا سکیں:

1۔ دستور میں شامل قرار دادِ مقاصد اور دستور کے آرٹیکل 31 پر کماحقہ عمل ہونا چاہیے جو بہرحال حکومت کی ذمہ داری ہے اور شاید کسی حد تک علمائے کرام کی بھی۔

2۔ معاشرے میں جاری استحصالی نظام کا خاتمہ ہونا چاہیے اور اسلام کے عدل اجتماعی کے اصولوں کی بنیاد پر معاشی انصاف ہونا چاہیے۔

3۔ اظہارِ رائے کی آزادی کے نام پر خطیب حضرات منبر و محراب پر، لکھاری لوگ صفحات اخبارات و رسائل پر اور میڈیا پرسنز ٹی وی چینلز پر جو رطب و یابس لوگوں کی سماعت اور بصارت پر بلا جواز پھینکتے رہتے ہیں اس کے لیے کوئی ضابطۂ اخلاق ہونا چاہیے۔

4۔ دینی مدارس کو بھی پابند کیا جائے کہ وہ قرآن و حدیث کی تعلیم اور جدید تعلیمی اداروں کو بھی پابند کیا جائے کہ وہ علم کی ترویج کے ساتھ اسلامی اقدار سے انحراف کے ارتکاب سے اجتناب کریں۔ دونوں قسم کے نظام ہائے تعلیم کی مادر پدر آزادی معاشرے کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔

5۔ ملک کی قومی اور بین الاقوامی پالیسی صرف قومی مفاد کی آئینہ دار ہو۔ ڈر اور خوف نیز دوسروں کی ترجیحات کے مطابق بنائی گئی پالیسیاں کبھی معاشرے میں امن اور سلامتی نہیں لا سکتیں۔

6۔ دہشت گردی، انتہا پسندی اور ظلم کے استیصال کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے عدل و انصاف۔ پارلیمنٹ، حکومت، عدالتی نظام اور وکیل حضرات کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ جس ملک میں قاتلوں کو یورپی یونین کے دباؤ پر سزا نہ دی جا سکے اور اگر دینا شروع ہو بھی تو صرف جنرل (ر) مشرف پر حملہ کرنے والوں کو پھانسی چڑھا کر میڈیا پر نمایاں (Highlight) کیا جائے تو اس طرح معاملات کیسے سدھریں گے؟

## علمائے دین سے ایک التماس

ہم البرہان کے صفحات پر خطبہ ہائے جمعہ کی اہمیت اور ان خطبوں کے تدریسی و تربیتی مواد پر کئی بار گزارشات پیش کر چکے ہیں۔ حالات اب اس طرف جا رہے ہیں کہ حکومت جمعہ کے خطبوں کے آڈٹ کا کوئی نظام قائم کرے اور انہیں اختلافات کی جائز حدود تک محدود کرنے کی کوشش کرے۔ حکومتِ پنجاب کا یہ عندیہ سامنے آ چکا ہے کہ کوئی آرڈی نیس تیاری کے مراحل میں ہے جس کے مطابق جمعہ کے خطیب حضرات کو پابند کیا جائے گا کہ وہ اپنا خطبہ خود ریکارڈ کر کے مقامی تھانے میں جمع کرائیں۔ یہ صورتِ حال اگر پیدا ہوتی ہے تو اِسے مستحسن قرار نہیں دیا جا سکے گا۔ ملی مجلس شرعی نے اپنے پلیٹ فارم سے خطبہ ہائے جمعہ کی رہنمائی کا فیصلہ کیا ہے جو ایک مثبت پیش رفت ہے۔ دینی معاملات اگر تھانے کچہری کی طرف نہ جائیں تو بہتر ہوگا۔ اس سلسلہ میں میری عاجزانہ گزارش یہ ہے کہ مختلف مسالک کے علمائے کرام ملی مجلس شرعی اور دیگر اجتماعی دینی پلیٹ فارموں سے پہل کاری کریں۔ جمعہ کے خطبات کے لیے سال بھر کے موضوعات طے کریں اور ایسا مواد تجویز کریں جس سے عوام الناس کی دینی تعلیم و تربیت کا مقصد کما حقہ پورا ہو سکے۔ نیز علمائے کرام باہمی مشاورت سے طے کریں کہ مذکورہ خطبوں میں اختلافی اور مسلکی رجحانات سے اجتناب برتا جائے گا اور قرآن و حدیث کو خطبوں کی بنیاد بنایا جائے گا نیز امن و سلامتی کا پرچار کرتے ہوئے دوسروں کی دل آزاری اور انتہا پسندی سے اجتناب کیا جائے گا اور دہشت گردی کے استیصال کے لیے اسلامی تعلیمات سے مدد لی جائے گی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ علمائے کرام اور دینی تنظیمات مقامی، ضلعی اور صوبائی سطح پر کوئی ایسا نظم قائم کر لیں جو خطباتِ جمعہ اور دیگر دینی تقریبات کے سلسلہ میں ہونے والی مجالس اور تقاریر کو قرآن و حدیث کی روشنی میں مثبت رنگ دینے کی کوشش کریں اور اس طرح خطیب حضرات کو پولیس سٹیشنز میں ایس ایچ او کے سامنے اپنے خطبے پیش کرنے سے بچا لیں۔

اسلام اور مغرب

محمد رشید☆

# 'جمہوریت کا اونٹ'
# اسلام خیمے سے باہر نہیں ہوگا

البرہان کی دسمبر 2014 کی اشاعت میں راقم کا مضمون اور اس پر مدیر البرہان جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب کا نقد شائع ہوا۔ اس ضمن میں مدیر محترم سے شکایت یہ ہے کہ

ا۔ آپ نے میرے مضمون ''جمہوریت......ایک ہتھیار، ایک پھندا'' کا عنوان بدل کر اپنی مرضی کا عنوان رکھ دیا۔ جس سے مضمون کے مرکزی خیال پر زد پڑتی ہے۔

۲۔ آپ نے میرے مضمون کے جواب میں تفصیلی تنقید کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ''لیکن برادرم رشید صاحب چاہتے ہیں کہ استثناء کے نام پر ہم مغربی جمہوریت کا پورا اونٹ ہی نگل لیں''۔ میری پریشانی یہ ہے کہ مجھے اپنے پورے مضمون میں کوئی ایک جملہ بھی ایسا نہیں مل رہا جس سے ضمنی طور پر ہی سہی وہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہو، جس کا الزام آنجناب نے مجھ پر عائد فرمایا ہے۔

مدیر محترم نے اپنے مضمون کے آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ ''مغربی جمہوریت آپ کے لیے بدو کا اونٹ ہے، آپ اسے تھوڑی سی جگہ اپنے خیمے میں گھسنے کی دیں گے تو یہ بالآخر سارے خیمے پر قابض ہو جائے گا اور آپ اپنے اسلام سمیت خیمے سے باہر ہوں گے''۔

اس ضمن میں عرض ہے کہ اگر آپ میرے مضمون کا اصل عنوان برقرار رکھتے تو شاید میرے مضمون پر وہ الزام عائد کرنے میں اتنی سہولت اور آسانی دستیاب نہ ہوتی جو اس عنوان کو ہٹا کر حاصل ہو گئی۔ اس عاجز کے مضمون کے درج ذیل اقتباسات کو ذرا دوبارہ ملاحظہ فرما لیا جائے:

ا۔ ''اسی کا نتیجہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے فقہاء اور اہل علم حضرات نے ''جمہوریت'' کو اس کے مخفی عقائد سے الگ کرتے ہوئے اور ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم'' کی بجائے اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان، اسلامی عبادات، اسلامی معاشرت اور اسلامی معیشت کا کلمہ جمہوریت کو پڑھواتے ہوئے اس کی Face Values کی بنا پر اسے ''اسلامی جمہوریت'' کا نام دے دیا۔ حالانکہ اس نئی صورت میں اس کا اصل اور قدیمی نام ''اسلامی خلافت'' تھا۔

---

☆ abu_munzir1999@yahoo.com

اس تناظر میں جمہوریت کو اس کے مخفی عقائد ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم'' سے کاٹ کر اسلامی عقائد، عبادات، معیشت، معاشرت اور قوانین کو اس میں داخل کر دینا فروعی اور جزئی قسم کی تبدیلی نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں جمہوریت کو اس کے مخفی عقائد سے کاٹ کر اس میں اسلامی عقائد و عبادات ڈال دینا، یہ محض جمہوریت کے ساتھ اسلامی اصولوں کی پیوندکاری کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت جمہوریت کو اسلام کا کلمہ پڑھوانے کا معاملہ ہے۔ یہ جمہوریت میں ایک جوہری اور بنیادی تبدیلی کا معاملہ ہے۔ چنانچہ وہ جمہوریت جو اپنے ''ملحدانہ ورلڈ ویو'' کی وجہ سے اسلام مخالف تھی، اس سے جب اس ملحدانہ ورلڈ ویو ہی کو کاٹ کر پرے پھینک دیا جائے تو ''اسلام سے اس کی مخالفت'' کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔''

۲۔ ''ہماری طالب علمانہ رائے میں جو اہل علم دلائل کی بنیاد پر یہ سمجھتے ہیں کہ ''مغرب کی لادین جمہوریت کو اسلامی نہیں بنایا جا سکتا۔ لہٰذا اسے رد کر دینا چاہیے۔'' رائے کی آزادی کے اصول کے تحت ان کے موقف کا احترام کیا جانا چاہیے، تاہم دعوتی نقطہ نظر سے ہم اس رویہ کو خلاف حکمت سمجھتے ہیں۔ ہماری عاجزانہ رائے میں یہ ایک نہایت سادہ، زیادہ درست اور نسبتاً واضح موقف ہے کہ جمہوریت کے مخفی عقائد ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم'' کا انکار کر دیا جائے اور ان ملحدانہ افکار کی بجائے اسلامی ایمانیات و عبادات کی روح کے اقرار کے ساتھ جمہوریت کی Face Vlues کی وجہ سے اس کے نام کو باقی رہنے دیا جائے تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں ہے۔ ہم دوبارہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس صورتحال میں اس رویہ کا اصل نام ''خلافت'' ہے۔ تاہم اگر ''کلموا الناس علی درج عقولھم'' (لوگوں سے ان کی عقلی سطح کے قریب رہ کر بات کرو) کے اصول کے تحت دعوتی مصلحت یا حکمت کی بنا پر اس رویہ کو ''اسلامی جمہوریت'' سے تعبیر کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

اس عاجز طالب علم کا سوال یہ ہے کہ درج بالا الفاظ میں پیش کیے گئے راقم کے موقف پر کیا یہ الزام درست مانا جا سکتا ہے کہ ان سطور کا راقم ''مغربی جمہوریت کا پورا اونٹ ہی نگلنے'' کی دعوت دے رہا ہے؟ راقم کا تو پورا مضمون ''مغربی جمہوریت'' کے اونٹ کے الحاد کی گردن ہی پر چھری چلانے کی دعوت پر مبنی ہے۔ اتنے واضح موقف کے باوجود بھی اگر آپ ایسا انتہائی نتیجہ اخذ فرما رہے ہیں کہ محض لفظ ''جمہوریت'' کے استعمال کے نتیجے میں ''الحاد و کفر'' اندر گھس آئے گا اور ''اسلام'' رخصت ہو جائے گا تو اس پر کوئی بین دلیل بھی تو ہونی چاہیے۔ کیا لفظ ''جمہوریت'' حرام، کفر اور شرک کے زمرے کی کوئی چیز ہے جس سے ہر حال میں اجتناب برتا جانا چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اس پر کوئی نص قطعی بھی دستیاب ہے؟

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ''انتخابی طریق کار'' (الیکشن) یا رائے عامہ (ووٹ) کے لازمی عنصر کی وجہ سے جمہوریت شراب کی طرح حرام ہے۔ کیونکہ انتخابِ حکومت بذریعہ ووٹ/ رائے عامہ کا اصول اسلام کے سیاسی مزاج سے گہری مطابقت رکھتا ہے، اسی تناظر میں قیام پاکستان کے بعد فقہا کرام اور اہل علم حضرات نے بذریعہ اجتہاد و اتفاق ''اسلامی جمہوریت'' کا تصور پیش کیا۔ انتخاب اور ووٹ کے عمل کو زیادہ سے زیادہ شفاف، معقول اور اسلامی اصولوں کے مطابق بنانے کی بات تو کی جا سکتی ہے اور کی جانی

چاہیے لیکن سرے سے ''ووٹ اور انتخاب'' کے عمل ہی کو غیر اسلامی قرار دے دینا اسلام کے مزاج اور اصولوں کے فہم میں کمی کا نتیجہ ہے۔اور میرے خیال میں اس معاملے میں آپ کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس طالب علم کا سوال یہ بھی ہے کہ ایک طرف تو آپ محض لفظ ''جمہوریت'' کے استعمال کو ہی ''مغربی جمہوریت کے پورے اونٹ کے گھس آنے'' کے مترادف قرار دے دیتے ہیں۔حالانکہ اس لفظ کو استعمال کرنے والا پورے شدومد سے ''جمہوریت'' کے ملحدانہ مخفی عقائد کے گلے پر چھری چلانے کی دعوت دے رہا ہے۔اور جمہوریت کے مخفی ملحدانہ عقائد کو جمہوریت سے کاٹ پرے پھینکنے کی بات کر رہا ہے اور اسلامی عقائد، عبادات، مقاصد، احکام کا کلمہ اسے پڑھوانے کی بات کر رہا ہے۔کیا لفظ ''جمہوریت'' (خمر، میسر، ربا، خنزیر اور اصنام پرستی وغیرہ) حرام، کفر اور شرک کی زمرے کا کوئی لفظ ہے کہ محض اس لفظ کے استعمال ہی سے ''کفر'' (مغربی فکر کی ساری لعنتوں اور الحاد) کا ارتکاب لازم ہو جاتا ہے۔اگر ایسا ہے تو کیا قرآن وسنت سے اس کی کوئی محکم بین دلیل اور برہان بھی ہے؟اس ادنیٰ طالب علم کا دین کے ایک استاذ سے سوال یہ بھی ہے کہ ''جمہوریت'' کو اسلام کا کلمہ پڑھوانے اور اس کی مابعد الطبعی اساس (الحاد) کو اس سے کاٹ پرے پھینکنے کے رویے کو محض لفظ ''جمہوریت'' کے جواز/استعمال کی پاداش میں آپ ''مغربی جمہوریت'' کے پورے اونٹ کو مسلم معاشرے کے ''خیمے'' میں داخل کرنے سے تعبیر فرما رہے ہیں، جو اسلام کو اس کے خیمے (مسلم معاشرے) سے نکال باہر کرے گا۔لیکن ذرا غور تو فرمائیں نومبر 2014 کے البرہان میں آپ خود جمہوریت، جس کے الحاد کو آپ کسی صورت اس سے علیحدہ نہ کر سکنے کے موقف کے پرزور وکیل ہیں یا دوسرے لفظوں میں جمہوریت کی مثبت اقدار اور اس کے غلیظ، فاسد اور ملحدانہ عقائد واطوار میں کسی صورت جدائی اور علیحدگی کے امکان کو آپ تسلیم نہیں کرتے، اسی مغربی جمہوریت کے پورے پیکج کو مسلم معاشرے میں استعمال کرنے کی آپ ان الفاظ میں اجازت عنایت فرما رہے ہیں:

''یہ سمجھ لینے کے بعد کہ موجودہ جمہوری جدوجہد کے ذریعے نہ تو فرد اور معاشرے کو اسلامی بنایا جا سکتا ہے اور نہ ریاستی قوت کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کیے جانے کا امکان ہے، بامر مجبوری اس جمہوری نظام میں حصہ لیا جائے کیونکہ اس کے بگاڑ کو روکنے، اس کے نقصانات سے بچنے اور ممکنہ فوائد سمیٹنے کی اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں کہ اس میں حصہ لیا جائے ورنہ تو شر کی قوتیں بے لگام ہو جائیں گی'' (البرہان نومبر 2014 بعنوان ''تین اہم معاملات میں نئے اجتہاد اور فتویٰ کی ضرورت'')

بزرگوار محترم! آپ ذرا اپنے الفاظ پر غور فرمائیں، آپ کے نزدیک مغربی جمہوریت کے بگاڑ کو روکنے، اس کے نقصانات سے بچنے اور ممکنہ فوائد سمیٹنے اور شر کی قوتوں کو بے لگام ہونے سے روکنے کے لیے بامر مجبوری یہ ضروری ہے کہ جمہوری نظام میں حصہ لیا جائے۔کیا یہ عجیب اور ناقابل فہم بات نہیں ہے کہ آپ کے نزدیک جو چیز (جمہوریت) سرتاپا شراب خوری کی طرح غلیظ اور حرام ہو (آپ نے اپنے

مضمون میں اسی لفظ سے جمہوریت کو تشبیہ دی ہے)، آپ کے مطابق اسی کے ارتکاب/ استعمال ہی سے اس کے نقصانات اور بگاڑ سے بچا جاسکتا ہے اور شر کی قوتوں کو لگام ڈالی جاسکتی ہے۔ اس طرز سوچ کے تحت تو شراب، زنا، جوا، سود اور کفر و شرک غرض ہر ہر حرام کے ارتکاب کی اجازت (''بامر مجبوری'' قرار دے کر) بآسانی دی جاسکتی ہے کہ اس اجازت کا مقصد اس کے بگاڑ کو روکنا، اس کے نقصانات سے بچنا اور ممکنہ فوائد سمیٹنا اور شر کی قوتوں کو لگام ڈالنا ہے۔

راقم نے جس ''اونٹ'' کے گلے پر چھری چلا کر اس کے تمام فاسد اور حرام اجزا نکال باہر پھینکنے اور محض مفید اجزا کے pick & choose پر مبنی طرز عمل کی پرزور حمایت کی (اور جمہوریت کے لفظ کو حرام، کفر اور شرک کے زمرے کے الفاظ کی چیز قرار دینے پر کوئی منصوص برہان دستیاب نہ ہونے پر محض اس لفظ کو اسلام کا تابع کر کے استعمال کرنے کی حمایت کی تھی)، آپ نے اس طرز فکر کو ''مغربی جمہوریت'' کا پورا اونٹ ''خیمے'' میں داخل کرنے سے تعبیر فرمایا۔ حیرت ہے کہ آپ اسی مغربی جمہوریت کے پورے اونٹ کو اس کے تمام تر الحاد، کفر، حرام، غلاظت اور گندگی سمیت (مغربی جمہوریت کا زندہ سالم اونٹ) ''بامر مجبوری'' مسلم معاشرے کے خیمے میں داخل کرنے کی اجازت عنایت فرما رہے ہیں کہ اس طرح اس کے بگاڑ، نقصانات سے بچنے اور شر کی قوتوں کو لگام ڈال کر فوائد سمیٹنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ مغربی جمہوریت کے اونٹ کو اس کی تمام غلاظتوں سمیت اپنے خیمے میں داخل کرنے سے ''اسلام'' بچ جاتا ہے لیکن اگر اس کی غلاظتوں کو کاٹ پھینکنے اور ان غلاظتوں اور مفاسد کے بغیر اسے اپنے خیمے میں داخل ہونے کی اجازت کی بات کی جائے اور اس طرز عمل کو ''اسلامی'' قرار دیا جائے تو کیا اس سے اسلام کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے؟ اور یہ طرز عمل ''اسلامی شراب خانے'' کے تصور کے ہم معنی ہوجاتا ہے؟ بزرگوار محترم! جنس شراب (خمر) کو تو قرآن و سنت کی واضح نصوص حرام قرار دے رہی ہیں کیا محض لفظ ''جمہوریت'' کو بھی قرآن و سنت کی کوئی نص (برہان) حرام قرار دیتی ہے؟

تفہیم کی غرض سے کیے گئے راقم کے سوالات کے لب و لہجے میں غیر شعوری طور پر اگر کوئی ''گستاخ'' عنصر آدھمکا ہو تو میں اس پر پیشگی معافی طلب کرتا ہوں۔ امید ہے ایک ادنیٰ طالب کے طالب علمانہ سوالات کی اس جسارت کو آپ درگذر کا مستحق سمجھتے ہوئے سائل کے سوال کا جواب ضرور عنایت فرمائیں گے۔

☆ اپنے حصے کا کام کیے بغیر دعاء پر بھروسہ کرنا حماقت ہے اور اپنی محنت پر بھروسہ کر کے دعاء سے گریز کرنا تکبر ہے۔

☆ لوگوں کے سامنے مسکراتے رہا کرو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتے رہا کرو کیونکہ دنیا مسکرانے والوں کو پسند کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ رونے والوں کو۔

اسلام اور مغرب　　ڈاکٹر محمد امین

# مغربی جمہوریت کی اسلامائیزیشن ممکن نہیں

## محمد رشید صاحب کے اشکالات کا جواب

لفظی بحث سے قطع نظر برادرم محمد رشید صاحب کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کو اس کے فکری مآخذ سے الگ کر کے اور اس میں اسلامی اصولوں کا پیوند لگا کر اسے مسلمانوں کے لیے قابل قبول 'اسلامی جمہوریت' میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ ہماری رائے اس کے برعکس ہے۔ برادرم محمد رشید صاحب اپنی رائے اور دلائل دے چکے، ہم بھی اپنا موقف بیان کر چکے تاہم رشید صاحب چونکہ اس سے مطمئن نہیں لہٰذا ہم ان کے لیے اور ان کی طرح سوچنے والے دیگر احباب کے لیے اپنا موقف ایک دفعہ پھر مزید وضاحت کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

۱- سب سے پہلے صورت مسئلہ کو ذہن میں رکھیے۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ فیصلہ فرما لیا تھا کہ اسلام قیامت تک آنے والے لوگوں کو رہنمائی مہیا کرے گا اس لیے وہ امور جن میں زمان ومکان کی تبدیلی اور تمدنی ترقی سے تغیر وتبدل کا امکان تھا وہاں اس نے رحمةً بالناس تفصیلی اور قطعی احکام دینے کی بجائے بنیادی اصول دینے پر اکتفا کیا اور تفصیل امت (کے مجتہدین) پر چھوڑ دی کہ وہ اپنی ضروریات اور حالات کے مطابق اس کا تفصیلی نظام ونقشہ بنالیں۔ سیاست بھی اجتماعی زندگی کا ایک ایسا ہی شعبہ ہے جہاں اسلام نے کچھ بنیادی تعلیمات تو دی ہیں لیکن ایک بنا بنایا اور گھڑا گھڑایا تفصیلی، قطعی اور ناقابل تغیر سیاسی نظام نہیں دیا۔

۲- امت نے ایک سیاسی نظام وضع کیا جو کبھی اچھی سپرٹ میں اور کبھی بری حالت میں تقریباً ایک ہزار سال تک چلتا رہا اور پھر اسے زوال نے آلیا۔ زوال کے اسباب جہاں دوسرے ہیں وہیں اس میں سیاسی نظام کا بھی ایک کردار ہے جو اسلام کی سیاسی تعلیمات اور صحیح سپرٹ کے مطابق کام نہیں کر رہا تھا۔

۳- اسلاف اور امت کے مجتہدین اور علماء واکابرین کا طریقہ متعلقہ اجتماعی شعبوں میں یہ تھا کہ وہ اسلامی تعلیمات کو بنیاد بنا کر اپنی ضروریات وحالات کا حل نکال لیا کرتے تھے۔ وہ قرآن حکیم اور رسول کریم ﷺ کے اس اسلوب کا بھی اتباع کرتے تھے کہ لوگ جن ضوابط اور رسوم کے مطابق زندگی گزار رہے ہوں ان میں جو چیز غیر اسلامی ہو اسے بدل دیا جائے ورنہ لوگوں کے عرف اور موانست کی وجہ سے اسے چلنا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے معاشی شعبے میں سکے نہیں بدلے اور زرعی شعبے میں محکمۂ مال کو مقامی زبانوں اور ان کی سابقہ رسوم کے مطابق ہی رہنے دیا اور انتظامی شعبے میں حضرت عمرؓ نے ایران

کے تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے 'دیوان' کا نظام قائم کیا اور صحابہ میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ لیکن فکری شعبے میں اس کے برعکس ہوا جمہور صحابہ نے خوارج کی انتہا پسندی کو صراحتاً رد کر دیا اور یونانی تہذیب کے اثرات کو بعض حکمرانوں اور بعض علماء نے قبول کیے لیکن امت کے اکابرین و مجتہدین کی بہت بڑی اکثریت نے ان کی مخالفت کی اور جمہور امت نے بحیثیت مجموعی ان کو رد کر دیا یہاں تک کہ آج معتزلہ کے موقف کو جاننے کے لیے براہ راست ان کا لٹریچر بھی دستیاب نہیں۔

۳-مسلمانوں کے زوال کے بنیادی اسباب اگرچہ داخلی تھے لیکن ان کے حریف بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن یہود و نصاریٰ نے نہ صرف ان کی ہلتی دیوار کو دھکا دے کر قعر مذلت میں گرایا بلکہ ان پر حملہ کر کے ان کو کچلا، تباہ و برباد کیا، لوٹا کھسوٹا غلام بنایا اور پھر مستقل غلام بنائے رکھنے کی منصوبہ بندی اور جدوجہد کی۔ پہلے انہوں نے مسلمانوں سے ان کا دین چھڑانے کی بھرپور کوشش کی لیکن مسلمانوں نے ہر ذلت برداشت کرنے کے باوجود اسلام نہیں چھوڑا۔ پھر اہل مغرب نے یہ تدبیر کی کہ مسلمانوں کو ان کے قابل فخر ماضی سے کاٹ دیا جائے اور انہیں اپنے ملحدانہ اور خلاف اسلام افکار کا رسیا اور شائق بنا دیا جائے اور چونکہ ان کی تہذیب غالب تھی اور وہ قوی اور بالا دست تھے اور مسلمان مغلوب و مقہور تھے لہٰذا ان کی یہ تدبیر کامیاب ہوگئی اور وہ مسلمان ممالک کو (برائے نام) سیاسی آزادی دینے کے باوجود ان کے حکمران اور موثر طبقات کو اپنی ذہنی غلامی کے شکنجے میں جکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ ترکوں نے اسی ذہنی غلامی کے جوش میں بری بھلی خلافت کو ختم کر دیا اور مغرب کا سیاسی جمہوری نظام اپنا لیا۔

۴-اب نو آزاد مسلم ممالک میں حکمران اس پر مصر تھے کہ وہ مغرب کا لادین جمہوری نظام نافذ کریں گے (اس وقت چونکہ مغربی جمہوریت زیر بحث ہے اس لیے ہم دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی بات نہیں کر رہے)۔ اب علماء کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ کیا کریں؟ خلافت کے خاتمے کو بنیاد بنا کر جدید اسلامی تحریکوں (الاخوان المسلمون، جماعت اسلامی وغیرہ) نے علماء و فقہاء کی ہزار سالہ روایت کے برعکس براہ راست سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ اگر مغربی جمہوریت میں بعض اسلامی اصلاحات کر لی جائیں تو اسے اسلامی لحاظ سے قابل قبول سمجھا جائے۔ روایتی علماء نے بھی اس سے اتفاق کر لیا۔

۵- جدید اسلامی تحریکوں اور روایتی علماء کی دینی سیاسی جماعتوں نے اس 'اسلامی جمہوریت' کے تحت سیاسی جدوجہد شروع کی لیکن پون صدی کی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی مسلم ملک اور معاشرے میں اسلام نہیں آیا۔ الٹا مغربی فکر و تہذیب کی ملحدانہ اقدار غالب آ گئی ہیں۔ اس سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے والی دینی جماعتوں کے کارکنوں کی اخلاقی حالت مضمحل ہوگئی ہے اور ایک عجیب کی طرح دنیا داری (جس میں آخرت پر ترکیز نہیں) اور مادہ پرستی عوام و خواص میں سرایت کر گئی ہے جو دین سے دوری پر منتج ہو رہی ہے۔

۶- ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ جدید دینی تحریکوں نے اوران کے بعد دیگر علماء کرام نے مغربی جمہوریت میں بعض تبدیلیوں کے بعد اس کی قبولیت کا جو اجتہادی فیصلہ کیا تھا وہ غلط ثابت ہوا ہے۔ ہماری رائے میں مغربی جمہوریت کو اسلامی لحاظ سے قبول کرنے کا فیصلہ اس لیے ناقص ثابت ہوا کہ اس میں مندرجہ ذیل حقائق کو ان کا صحیح وزن نہیں دیا گیا تھا:

i- قرآن وسنت کی متعدد نصوص صراحتاً بتاتی ہیں کہ یہود و نصاریٰ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن اور بدخواہ ہیں۔

ii- ان کی اسلام و مسلم دشمنی مسلمانوں کے مشاہدے و تجربے میں آ چکی ہے۔

iii- مغربی جمہوریت کے نہ صرف فکری مآخذ (ہیومنزم، سیکولرزم......وغیرہ) ملحدانہ اور خلاف اسلام ہیں بلکہ یہ اصول اس جمہوریت کے قائم کردہ اداروں میں بھی سرایت کر چکے ہیں جیسے:

(ا) پارلیمنٹ کی بالادستی اور تقدس کا تصور (ب) انسانوں کے بنائے ہوئے آئین کی بالادستی اور تقدس کا تصور اور عدلیہ کا اس کو حتمی معیار سمجھ کر فیصلے کرنا۔ اس آئین سے بغاوت کی سزا موت ہے (یہ دونوں تصور حاکمیت الٰہ اور شریعت [قرآن وسنت] کی بالادستی کے خلاف ہیں)۔ (ج) 'عوام' کی حاکمیت (جب کہ اسلامی اصول عوام سے مشاورت لیکن ساتھ ہی تقویٰ ومیرٹ کی ترجیح پر زور دیتے ہیں)۔ (د) انتخابات میں خود کو قیادت کے لیے پیش کرنا اور اپنی کامیابی کے لیے جدوجہد کرنا اور مال خرچ کرنا جائز (جب کہ اسلامی نصوص اس کی حمایت نہیں کرتیں)۔ (ھ) پارلیمنٹ میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی مستقل تقسیم اور اسی بنیاد پر فیصلے کرنا (جب کہ اسلام 'حق' کی حمایت کا حکم دیتا ہے خواہ اس کی زد اپنی ذات یا اعزہ اقربا یا اپنے قبیلے پر پڑتی ہو) (و) ارکان پارلیمنٹ کو حق قانون سازی ہونا اور ان کے لیے صلاحیت کی کوئی شرائط نہ ہونا (جب کہ اسلام میں اجتہاد صرف فقہاء و مجتہدین کو سزاوار ہے) (ز) حکمرانوں پر دورِ حکمرانی میں قانون کا اطلاق نہ ہونا اور انہیں اعلیٰ عدالتوں کی دی گئی سزا معاف کرنے کا اختیار ہونا (یہ دونوں باتیں صریحاً خلاف اسلام ہیں)۔

یہ چند چیزیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ تفصیل اور باریکی سے دیکھیں تو جمہوری اداروں کی ورکنگ کے اکثر اصول غیر اسلامی ہیں۔

یہ خرابیاں مغربی جمہوریت میں تھیں۔ ہم نے اس پر عمل کرتے ہوئے اس میں مزید خرابیوں کا اضافہ کر لیا جیسے ووٹ خریدنا اور پیسے کا غلط استعمال، خاندان برادری کی بنیاد پر ووٹ دینا، جعلی ڈگریاں،

جھوٹا پراپیگنڈا کرنا، اور فرقے کی بنیاد پر سیاسی جماعت بنانا اور انتخابات میں جھرلو کے بیسیوں ہتھکنڈے ایجاد کرنا...... وغیرہ جس کی وجہ سے شرفاء اور غیر سرمایہ دار نہ اس میں حصہ لے سکتے ہیں اور نہ کامیاب ہوسکتے ہیں۔ علماء اور دینی عناصر بعض بنیادی اصول تو منوانے میں کامیاب ہوگئے جیسے حاکمیت الہٰ کا اصول اور قرآن وسنت کے خلاف قانون نہ بنانے کا اصول (ان اصولوں کو پالیسی امور میں رکھا گیا اور انہیں آئین پر حاوی نہیں ہونے دیا گیا) لیکن جمہوری اداروں کو اسلامی اصولوں کے مطابق نہ ڈھالا گیا بلکہ ہم نے اس میں مزید غیر اسلامی اصولوں کا اضافہ کردیا، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

iv- مغرب جمہوریت کو اسی طرح مقدس بنا کر پیش کرتا ہے جس طرح اہل مذہب کے عقائد ہوتے ہیں اور مغرب اسی طرح جمہوریت کو دنیا بھر کے ممالک میں لاگو کرنے کا جذبہ وجنون رکھتا ہے اور علی الاعلان دوسرے ممالک میں اسے نافذ کرانے کے لیے کروڑوں کے فنڈز مختص کرتا ہے جس طرح کہ اہل مذاہب اپنا دین پھیلانے کے لیے مشنری جذبے سے کام کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ مغرب نے جمہوریت کو دنیا میں مغربی فکر وتہذیب اور اور اس کی اقدار اور اداروں کو پھیلانے کا ایک ہتھیار اور ذریعہ بنایا ہوا ہے اور عملاً مغرب نے جمہوریت کے ذریعے مسلم ممالک میں مغربیت کے نفوذ کا کامیاب تجربہ کیا ہے چنانچہ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے کہ مسلم معاشرے جمہوریت کے راستے مغربی فکر وتہذیب کی مادہ پرستی، سیکولرزم، فحاشی وعریانی...... وغیرہ قبول کرتے جارہے ہیں۔

v- مغرب جمہوریت کے ذریعے مسلم معاشروں اور ریاستوں میں مداخلت کرکے وہاں سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو زوال سے نکلنے میں مزاحم ہوا ہے اور ان کی ترقی اور خوشحالی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ متجدد دین کی حمایت کرکے اسلام کا ایک نیا اور مغرب گزیدہ ایڈیشن تیار کروارہا اور پھیلا رہا ہے۔ مزید یہ کہ وہ اسلامی مآخذ اور ہیروز کی ہوا خیزی پر تلا ہوا ہے۔ جعلی قرآن چھاپ کر پھیلایا جارہا ہے اور علی الاعلان قرآن جلایا جارہا ہے۔ پونے دو ارب مسلمانوں کے محبوب رہنما حضرت محمدﷺ کے کارٹون بنا کر ان کے تمسخر اور استہزاء کو اس نے معمول بنالیا ہے اور......

vi- ہمارے اسلاف نے اگر سیاست میں عملی حصہ نہیں لیا اور حکمرانوں کو صرف وعظ ونصیحت اور تنقید تک محدود رہے تو ساتھ انہوں نے تعمیر فرد (تعلیم اور تزکیۂ نفس)، اصلاح معاشرہ (امر بالمعروف ونہی عن المنکر)، قانون سازی (فتویٰ واجتہاد) اور عدلیہ میں اپنے کردار کے ذریعے فرد، معاشرے اور ریاست کو دین سے جوڑے رکھنے میں انتہائی اہم اور بنیادی کردار ادا کیا۔ اب جن جدید دینی تحریکوں اور

علماء کرام نے سیاسی جدوجہد میں براہ راست حصہ لینا شروع کیا ہے تو وہ مندرجہ بالا انتہائی اہم شعبوں میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں اور یہ بہت بڑا نقصان اور المیہ ہے اور اس کے تباہ کن اثرات مسلم فرد، معاشرے اور ریاست پر پڑ رہے ہیں۔

vii- منہج کے اس فرق کو ملحوظ رکھیے کہ اسلاف اسلامی اصولوں کو بنیاد بناتے تھے اور حالات اور واقعات کو ان اصولوں پر منطبق کرتے، ناپتے اور ان کے مطابق ڈھالتے تھے۔ ہم آج مغربی اصولوں اور اداروں (مثلاً جمہوریت) کو بنیاد اور معیار بنا رہے ہیں اور ان میں بعض اسلامی اصولوں کو پیوند کر کے انہیں 'اسلامی' قرار دے رہے ہیں۔ فرق صاف ظاہر ہے کہ پہلے طریقے میں اسلامی اصول ثابت و قائم رہتے تھے اور تبدیلی واقعات و حالات میں آتی تھی۔ دوسرے طریقے میں ہم بالواسطہ طور پر مغربی اصول واقدار کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں اور اسلامی اصولوں کو ان میں پیوند کر کے انہیں مشرف بہ اسلام کرتے ہیں۔ گویا یہ مغربی اصولوں کو اسلامی بنانے کی بات نہیں بلکہ اسلامی اصولوں کو مغرب کے مطابق بنانے کا طریقہ ہے۔

viii- سیاسی نظام میں اس اصول کی تطبیق یوں ہونی چاہیے تھی کہ ہم اسلام کے سیاسی نظام کو بنیاد بناتے، اس کا نام اور اصطلاحات استعمال کرتے اور اس کی تفصیلی نقشہ گری کرتے ہوئے مغربی اداروں کے کسی جزو کو اگر ہم اپنی ضرورت کے لیے مفید سمجھتے تو اس میں اسلامی لحاظ سے ضروری تبدیلیاں کر کے اسے اپنے نظام کا حصہ بناتے لیکن اس کے برعکس ہم نے یہ کیا ہے کہ مغربی جمہوریت کو قبول کر لیا ہے اور اس میں کچھ اسلامی اصولوں کی جزوی پیوند کاری اس طرح کی ہے کہ وہ موثر ثابت نہیں ہوئی اور نہ وہ مغربی جمہوریت اور اس کے اداروں کے ملحدانہ مزاج کو بدل پائی ہے۔ نتیجتاً ہم پر مغربی تہذیب غالب آ گئی ہے نہ کہ اسلام۔ بلکہ اس کا بہت بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ ہمارے علماء اور دینی سیاسی جماعتیں اس غلط نظام کا حصہ بن کر اس میں جذب ہو کر رہ گئی ہیں اور اب اسلام کے سیاسی نظام کا قیام اور بحالی ان کا ہدف ہی نہیں رہا بلکہ ''ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد'' والا معاملہ ہو گیا ہے جیسے ایک شخص پردیس گیا اور پردیسی ہو گیا، وہاں کی نیشنلٹی لے لی، وہاں شادی کر لی، رچ بس گیا اور وطن قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا جسے وہ کبھی کبھار یاد کر لیتا ہے اور بس۔

ان دلائل کی بنیاد پر ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دینے کی ہمارے علماء کرام کی اجتہادی رائے صحیح ثابت نہیں ہوئی اور اب اس حوالے سے ایک نئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ ہماری اس گزارش پر اگر اکابر علماء کرام غور فرمائیں تو اس کی کئی صورتیں

ہوسکتی ہیں مثلاً:

۱- یہ فیصلہ بھی ہوسکتا ہے کہ علماء کرام براہ راست سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا اسی طرح ترک کر دیں جیسے انہوں نے صدر اسلام میں یہ فیصلہ کیا تھا اور دوسرے انتہائی اہم شعبوں میں کام کریں یعنی تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کے لیے تعلیم و تربیت ، دعوت و اصلاح، تزکیۂ نفس، امر بالمعروف ونہی عن المنکر ......وغیرہ

۲- یہ فیصلہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی جدوجہد جمہوری نظام کے باہر رہ کر کی جائے اور علماء و دینی عناصر اس وقت تک جمہوری انتخابی جدوجہد میں فعال حصہ نہ لیں جب تک وہ عوام کی حمایت سے اسلام کا سیاسی نظام قائم نہ کروالیں۔ یہ ایک قابل لحاظ نقطۂ نظر ہے اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور دوسرے کئی لوگ اسی رائے کے موید ہیں۔

۳- علماء کرام اور دینی سیاسی جماعتیں موجودہ اسلامی جمہوریت کو ایک ناگزیر برائی سمجھ کر قبول کریں۔اس میں خود کو Unfit اور Uneasy محسوس کریں اور اسلام کے سیاسی نظام کے احیاء اور بحالی کے لیے پورا زور لگائیں اور اس منزل کے سر ہونے تک مجبوراً موجودہ غلط اور بانجھ نظام میں بامر مجبوری حصہ لیں اور اس کی وجہ سے ہونے والے بگاڑ کو بڑھنے سے روکیں اور صرف اتنے کام پر انحصار نہ کریں بلکہ تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کے جن کاموں کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان پر بھی اپنی بھرپور توجہ اور قوت کو مرکوز کریں۔

ix- موجودہ اسلامی جمہوریت کو غلط، ناقص اور ناگزیر برائی سمجھ کر اس میں حصہ لینے اور اسے عین اسلامی سمجھ کر اسے بطیّبِ خاطر قبول کرنے کے نتائج میں جو فرق ہے، وہ بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے تاہم جن کو بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی، ان کے لیے ہم اسے مزید وضاحت کے ساتھ ذیل کے جدول میں بیان کیے دیتے ہیں:

| اسلامی جمہوریت کو ناگزیر برائی سمجھنا | اسلامی جمہوریت کو بطیّبِ خاطر قبول کرنا |
|---|---|
| ☆ یہ لوگ اپنا ہدف اور اصل کام اسلام کے سیاسی نظام کے قیام کو سمجھیں گے اور اس کے لیے فکرمند اور کوشاں رہیں گے | ☆ 'اسلامی جمہوریت' سے باہر اور اس کے علاوہ کسی 'اسلامی سیاسی نظام' کی تڑپ ان کے اندر مفقود ہوتی چلی جائے گی یہاں تک کہ یہ کام انہیں یاد بھی نہیں رہے گا |

☆ اسلام کے سیاسی نظام کا قیام چونکہ اسلامی ماحول اور اسلامی فرد کا متقاضی ہے لہٰذا یہ گروہ اسلامی تناظر میں تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی (یعنی اصلاح فرد و معاشرہ) کے لیے کوشاں رہے گا۔

☆ اس گروہ کے نزدیک چونکہ اصل کام اسلامی جمہوری جدوجہد اور اقتدار کا حصول ہے لہٰذا تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی کی اہمیت اس کی نظروں میں کم ہوتی چلی جائے گی۔

☆ یہ گروہ مغربی فکر و تہذیب کو خلاف اسلام سمجھ کر زندگی کے سارے شعبوں میں اسے ردّ کرنے کی کوشش کرے گا۔

☆ یہ گروہ مغربی جمہوریت سے بالواسطہ طور پر متاثر ہونے کی وجہ سے مغربی فکر و تہذیب سے موانست محسوس کرے گا اور اسے ردّ کرنے کا خیال اسے نہیں آئے گا۔

☆ یہ گروہ اسلام کے حق میں قانون سازی کو زیادہ اہمیت نہیں دے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حکمران اور ریاستی ادارے ان قوانین پر عمل درآمد نہیں کریں گے۔

☆ اسلام کے حق میں قانون سازی کو یہ گروہ اہم پیش رفت سمجھے گا۔

x- ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اپنا مدعا واضح کر دیا ہے۔ برادرم محمد رشید صاحب کو اگر ہماری رائے سے اتفاق نہیں تو کوئی بات نہیں وہ اپنی رائے پہ قائم رہ سکتے ہیں۔ پہلوں کا موقف کچھ دلائل پر مبنی تھا جن سے ہم آج اختلاف کر رہے ہیں اور ہمارا موقف بھی کچھ دلائل پر مبنی ہے، جن سے اختلاف ممکن ہے اور اس میں کوئی ہرج نہیں بلکہ بقول شاعر ؎

گل ہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

ہمارا موقف جمہور یا اکثریت کی رائے کے مطابق نہیں ہے اگرچہ یہ رائے کوئی بڑا تفرد بھی نہیں کہ دوسرے بہت سے لوگ بھی جمہوریت کو غیر اسلامی اور نا قابل قبول سمجھتے ہیں۔ تاہم، ہم اپنی رائے دلائل کے ساتھ پیش کرتے رہیں گے تا آنکہ اکثر لوگ ہماری رائے کو قبول کر لیں۔

اس بحث کو ہم یہاں سمیٹتے ہیں کہ دونوں فریق اپنے اپنے دلائل دے چکے اور ان کی مزید تکرار کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ **وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين.**

اسلام اور مغرب		سبوخ سید

# ملالہ کا سٹیج ڈرامہ - پردہ اُٹھتا ہے
## ہم مغرب کے ایجنٹ کیسے بنتے ہیں اور مغرب اپنے ایجنٹ کیسے تیار کرتا ہے؟

ملالہ کو ملنے والے نوبل ایوارڈ کی تقریب کی کوریج کے لیے میرے ایک صحافی دوست بھی گئے ہوئے ہیں۔ معروف آدمی ہیں لیکن ان کا نام اس لیے نہیں لکھ رہا کہ انہوں نے مجھے اپنا حوالہ دینے سے روکا ہوا ہے۔ کل شام انہوں نے اسکائپ پر اپنے کسی ذاتی کام کے لیے مجھ سے بات کی۔ بات مکمل ہونے پر میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ملالہ سے ملاقات ہوئی؟ تو اس پر انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے پورا قصہ سنا دیا۔ کہنے لگے کہ 'گزشتہ ایک ہفتے سے ملالہ کے ساتھ ہی ہوں۔ جب ناروے کے ائیرپورٹ پر پہنچا تو ملالہ اور اس کا والد خود لینے آئے تھے۔ میں نے راستے میں محسوس کیا کہ ملالہ اور اس کے والد کے درمیان گفتگو بہت کم ہو رہی ہے۔ ملالہ گاڑی میں والد کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے اپنا آئی پیڈ لے کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی اور امریکن لہجے میں نوبل پرائز والی تقریر کے رٹے مارنے شروع کر دیے۔ میں ملالہ کے والد ضیاء الدین کے ساتھ پاکستان کے سیاسی حالات اور دھرنوں کی سیاست پر گفتگو میں مگن ہو گیا۔ اس دوران ضیاء الدین نے میرے ایک لطیفے پر قہقہہ لگایا تو ملالہ نے اپنے والد کو گھور کر دیکھا۔ اس کے بعد ہوٹل تک ملالہ کے والد نے پھر زیادہ بات چیت نہیں کی۔

جب ہم گھر پہنچے تو ایک برطانوی خاتون پروفیسر ملالہ کا گھر میں انتظار کر رہی تھی۔ اس سے ملنے کے بعد ملالہ اس کے ساتھ کمرے میں بیٹھ گئی۔ اس خاتون نے ملالہ سے زبانی تقریر سنی تو ملالہ ٹھیک طریقے سے تقریر نہیں کر پا رہی تھی۔ خاتون نے ملالہ سے کہا کہ 'دیکھو یہ کوئی سوات کی ڈائری نہیں جو تمہارے باپ نے کرائے پر لکھوائی تھی' اگر محنت نہیں کرو گی تو اس دن سب کو شرمندہ کر دو گی۔ ملالہ نے یہ سن کر رونا شروع کر دیا اور کہنے لگی کہ جب کیلاش ہندی میں تقریر کر سکتا ہے تو مجھے کیوں پشتو میں تقریر نہیں کرنے دی جا رہی۔ اس پر ملالہ کی ماں اور اس کا والد ضیاء الدین ملالہ کے پاس چلے گئے اور کہا کہ دیکھو بیٹا' تم ہمارے سارے ایجنڈے کو تباہ کر رہی ہو، خدا کے لیے تھوڑی محنت کرو، ورنہ ہم مارے جائیں گے۔ اس پر ملالہ نے اپنے باپ کو کھری کھری سناتے ہوئے کہا کہ ''شرم نہیں آتی، پیسوں کے لیے اپنی بیٹیوں پر خود ہی حملے کراتے ہو اور پھر طالبان پر الزام لگا دیتے ہو۔ تم لوگوں کی وجہ سے پورا پاکستان مجھے گالیاں دے رہا ہے''۔ یہ سن کر ملالہ کی ماں رونے لگی۔ ملالہ کو اپنی ماں سے بہت پیار ہے۔ ماں کو روتا دیکھ کر اس نے ماں سے وعدہ کیا کہ وہ جلد تقریر تیار کر لے گی لیکن ایک شرط پر۔ شرط یہ ہے کہ اس کی تقریر کو آسان انگریزی میں لکھا جائے اور اسے بی بی سی والے رپورٹر سے ہی لکھوایا جائے جس نے میری گل مکئی والی ڈائری لکھی تھی۔ ملالہ کے ابو نے یہ سنا تو وہ ناراض ہونے لگے کہ وہ رپورٹر تو پہلے ہی نوبل پرائز میں اپنا حصہ مانگ رہا ہے۔

ضیاءالدین کوکسی نے فون پر بتایا کہ وہ رپورٹر ملالہ کوایوارڈ ملنے سے اگلے دن اس ڈائری کے حوالے سے انکشافات سے بھرپور ایک پریس کانفرنس بھی کرنا چاہتا ہے۔ یہ سن کر ملالہ کا والد کافی خوفزدہ ہوگیا کافی تکرار اور سوچ بچار کے بعد اس رپورٹر کو پراگ سے بلوایا گیا۔ جہاں وہ اب ایک دوسرے ادارے کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اس رپورٹر نے بی بی سی اسٹائل میں ملالہ کے لیے ایک سادہ سی تقریر تیار کی جو اسے یاد کرائی گئی۔

ملالہ نے نوبل انعام والی تقریر کم از کم ۱۰۰ مرتبہ تو ہمیں سنائی۔ دوران تقریر وقفہ کیسے کرنا ہے، مسکرانا کیسے ہے؟ تالیوں کا وقفہ، سب کچھ تیار کرایا گیا۔ یہاں تک کہ میڈل لے کر ہاتھ فضا میں بلند کرنے تک۔ ملالہ کوٹھیک طریقے سے بسم اللہ بھی پڑھنی نہیں آتی تھی، جس کے لیے پاکستان سے اسکائپ پر ایک آن لائن قاری کا انتظام کیا گیا۔ میں حیرانی اور پریشانی کے عالم میں یہ سب دیکھتا رہا کہ کس طرح امریکی اپنے ایجنٹوں کو تیسری دنیا میں لیڈر بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہیں مجھے یہ بتایا گیا کہ پاکستان میں ٹی وی چینلز کو بھی خریدا گیا ہے کہ وہ اس موقع پر میراتھان ٹرانسمیشن کریں گے۔ تو بھائی جان یہ ہے ڈرامے کا اصل اسکرپٹ، انعام کا اصل حقدار عبدالستار ایدھی تھا لیکن ملالہ کوایدھی سے چھینا ہوا انعام دے دیا گیا۔

**Source:**https://www.facebook.com/l.php?u=https%3A%F%2Ftwitter.com%2FSaboohSyed%2Fstatus%2F542713499541979136&h=TAQHBOujf

بقیہ صفحہ ۵۷

**iv- غیر مسلموں کے حقوق:** ۱-ہمایوں کبیر (بھارت) 'جمہوریت اور اقلیتیں' ۲-چندرا مظفر (ملائیشیا) 'اسلام اور بین الاقوامیت' ۳-محمد طالبی (تیونس) 'مذہبی آزادی' ۴-علی بولاق (ترکی) 'میثاق مدینہ' ۵-رسمیر محمود حاجی (بوسنیا) 'شکست نہیں دفاع اور نرم روی۔

**v- حریت فکر :** ۱-علی شریعتی (ایران) 'انسانیت اور اسلام' ۲-یوسف القرضاوی (مصر-قطر) انتہا پسندی ۳-محمد آرکون (الجزائر) 'اسلام اور عصر جدید' ۴-عبداللاہی احمد (سوڈان-امریکہ) 'شریعہ اور بنیادی انسانی حقوق' ۵-الحاج عزیز اللہ (نائیجیریا) 'علماء کا مسئلہ' ۶-عبدالکریم سروش (ایران) 'مذہبی علم کا ارتقاء وتنزل۔

**vi- ترقی:** ۱-علامہ محمد اقبال (برصغیر پاک وہند) 'اسلام میں تصور حرکت' ۲-محمود محمد طٰہ (سوڈان) 'اسلام کا دوسرا پیغام' ۳-نور چوش ماجد (انڈونیشیا) 'اسلامی فکر کے احیاء کی ضرورت' ۴-ماما دیودیا (سینگال) 'اسلام اور ہیومنزم' ۵-فضل الرحمٰن (پاکستان-امریکہ) 'اسلام اور جدیدیت' ۶-شبیر اختر (پاکستان-برطانیہ) 'اسلام اور عصر جدید کا چیلنج'۔

بڑی تقطیع پر ۳۴۰ صفحات کی یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ۱۹۹۸ء میں شائع کی اور پاکستان میں اچھے انگریزی کتب فروشوں اور لائبریریوں سے اس کا آسانی دستیاب ہونا متوقع ہے۔

کس قیامت کے یہ نامے

# دینی مدارس اور فرقہ واریت

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں شروع دن سے البرہان کا قاری ہوں کیونکہ مجھے اس میں کچھ جان محسوس ہوئی تھی اور میں یہ سمجھا تھا کہ آپ محض کٹھ ملا نہیں ہیں جب کہ عام مولویوں کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں ہے لیکن پچھلے ماہ آپ نے مجھے مایوس کیا جب میں نے آپ کو ایک مختصر سا مضمون بھیجا جس میں مولویوں کی فرقہ واریت اور ان کے مدرسوں پر کچھ تنقید تھی۔ اور جب آپ کی طرف سے جواب نہ آیا تو میں نے آپ کو فون کیا۔ فون پر آپ نے مجھے کہا کہ مضمون کا لہجہ بہت سخت ہے اور ہلکے پھلکے انداز میں کہا کہ آپ مجھے علماء سے لڑانا چاہتے ہیں جب کہ میں علماء کو ناراض نہیں کر سکتا۔

محترم! میں نے اپنے مختصر مضمون میں صرف دو باتیں لکھی تھیں ایک یہ کہ مولوی حضرات اس پر غور کریں کہ ان کے مدرسوں کی افادیت کیا ہے اور کیا وہ عوام کی ایمانی اور اخلاقی حالت سدھارنے میں کچھ معاون ثابت ہوئے ہیں؟ اگر ان کا جواب ہاں میں ہے تو دلائل دیں تاکہ ہمیں بھی اس سے آگاہی ہو اور اگر ان کا جواب نفی میں ہو تو انہیں ان مدرسوں کے ڈھب کو تبدیل کر دینا چاہیے یا انہیں بند کر دینا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ جس فرقہ واریت اور مسلک پرستی کو ان مولویوں نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے وہ خلاف قرآن ہے بلکہ قرآن کی رو سے وہ شرک ہے۔ ان کے باہمی خلفشار کا سبب ان میں اخلاص اور فراست کی کمی اور خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھوں میں کھیلنا ہے۔ یہی فرقہ وارانہ تعصّبات ہیں جنہوں نے قوم کو بھی تقسیم کر رکھا ہے لہٰذا مولوی حضرات کو یہ فرقہ پرستی بہر قیمت چھوڑ دینی چاہیے۔

آپ نے مجھے یہ نہیں کہا کہ میری باتیں غلط ہیں بلکہ یہ کہا کہ آپ علماء کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ سوال یہ ہے کہ اس پرچے کا کیا فائدہ جس میں آپ حق بات نہیں کہہ سکتے۔ کیا آپ نے پرچہ علماء کو راضی رکھنے کے لیے جاری کر رکھا ہے۔ اگر آپ اس میں سچ نہیں چھاپ سکتے تو اسے بند کر دیں اور کوئی دوسرا مفید کام کریں۔

والسلام،

آفتاب عروج (چنیوٹ)

**پس نوشت:** میں نے تو یہ مضمون پچھلے ماہ لکھا تھا لیکن سانحۂ پشاور کے بعد ریاست نے بھی مدرسوں اور فرقہ واریت کی مذمت کر دی ہے بلکہ انہیں کچلنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس سے میرا موقف صحیح ثابت ہو گیا ہے۔

تبصرۂ کتب

مدیر

# لبرل اسلام 'Liberal Islam'

## از چارلس کرزمین (Charles Kurzman)

چارلس کرزمین نے 'روایتی اسلام'اور'احیائی اسلام'(Revivalist Islam) کے مقابلے میں'لبرل اسلام' کے حوالے سے عالم اسلام کے مسلم دانشوروں کے منتخب مضامین کا یہ جامع مجموعہ مرتب کیا ہے۔اس کے نزدیک لبرل اسلام وہ ہے جس میں کوئی دانشور قرآن وسنت کی نصوص کی لغوی (Literal) تشریح کرنے کی بجائے لبرل (Liberal) تشریح کرتا ہے اوراس میں عصری افکار اور تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ وہ مسلم دانشور ہیں جو مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر ہیں اور اسی مرعوبیت کے تناظر میں وہ اسلامی فکر کی نئی مغرب زدہ تشریح کرتے ہیں۔

مرتب نے ۲۳ صفحات کے ڈبل کالم مبسوط مقدمے کے بعد چھ عناوین کے تحت مسلم دانشوروں کی ۳۲ منتخب تحریریں جمع کی ہیں۔ہم علوم اسلامیہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی معلومات کے لیے اس کی تفصیل عرض کیے دیتے ہیں:

**i- مذہبی ریاست کی مخالفت:** ۱-علی عبدالرازق (مصر)'پیغام نہ کہ حکومت-مذہب نہ کہ ریاست' ۲-محمد خلف اللہ (مصر)'قانون سازی کا بااختیار ادارہ' ۳-آیت اللہ طالقانی (ایران) طالقانی کا آخری خطبہ ۴-محمد سعید العشماوی (مصر) شریعہ-قانون اسلامی کی تقنین۔

**ii- جمہوریت:** ۱-محمد ناصر (انڈونیشیا)'انڈونیشی انقلاب' ۲-ایس ایم ظفر (پاکستان) 'احتساب، پارلیمنٹ اوراجتہاد' ۳-مہدی بازرگان (ایران)'مذہب اورآزادی' ۴-دیماسانگی پنڈرتو (فلپین)'مسیحی مسلم جمہوریت' ۵-راشد غنوسی (تیونس)'غیر اسلامی حکومت میں شمولیت' ۶-صادق سلیمان (عمان)'جمہوریت اورشوریٰ'۔

**iii- خواتین کے حقوق:** ۱-ناظرہ زین الدین (لبنان)'حجاب کی بحث' ۲-بینظیر بھٹو (پاکستان)'سیاست اورمسلم خواتین' ۳-فاطمہ مرنیسی (مراکش) 'اسلام میں حقوق نسواں کی نسائی تشریح' ۴-امینہ ودود (امریکہ)'قرآن اورخواتین' ۵-محمد شہرور (شام)'اسلام اورخواتین کے حوالے سے ۱۹۹۵ء کی بیجنگ کانفرنس۔ (باقی صفحہ ۵۵ پر)

# سکول متوجہ ہوں

## اسلامی نصابی کتب کی تیاری اور تربیت اساتذہ کے اہم منصوبے میں سرمایہ کاری کی دعوت

تحریک اصلاح تعلیم ایک عرصے سے موثر اسلامی نصابی کتب اور تربیت اساتذہ کی اہمیت کی طرف متعلقہ احباب کو متوجہ کرتی رہی ہے۔ اب ہم اس کے لیے ایک قابل عمل منصوبہ پیش کررہے ہیں۔

تحریک کے پاس ایسے ماہرین کی افرادی قوت موجود ہے جو موثر اسلامی نصابی کتب کی تیاری اور تربیت اساتذہ میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے سکول بھی کافی تعداد میں موجود ہیں جو موجودہ تعلیمی صورت حال سے مطمئن نہیں اور اسے موثر اسلامی رنگ دینا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں گروپ اگر اشتراک عمل کرلیں تو ان کے باہمی تعاون سے بہت اچھے نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

**منصوبہ:** اس کام کے لیے تحریک نے صفاء ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (Safa Educational Research and Training) [Serat یا ''سیرت''] قائم کیا ہے اور 'سیرت پبلی کیشنز' کے خوبصورت نام سے اس کام کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔ تاہم یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی بھی کام مالی پشت پناہی کے بغیر نہیں ہوسکتا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مالیات کی فراہمی مالی مفاد کے بغیر آسان نہیں ہوتی۔ اس مقصد کے لیے ہم نے سیرت پبلی کیشنز کو مشارکہ کی بنیاد پر چلانے کا پروگرام تیار کیا ہے۔ سیرت پبلی کیشنز کے لیے ابتدائی سرمایہ پچاس لاکھ روپے طے کیا گیا ہے۔ یہ پچاس لاکھ کا سرمایہ ایک ایک لاکھ کے پچاس شیئرز پر مشتمل ہوگا۔ یہ شیئرز سکولوں کے مالکان اور ان خواتین وحضرات کو پیش کیے جائیں گے جو نظام تعلیم کو اسلامی نظریہ کے مطابق ڈھالنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ کوئی فرد یا ادارہ زیادہ سے زیادہ پانچ حصص خرید سکے گا۔ سیرت پبلی کیشنز میں سرمایہ لگانے والوں کے لیے مالی فوائد ذیل میں دیئے گئے ہیں۔ یاد رہے کہ پہلے دو سال نفع کی تقسیم نہیں ہوگی اور اس طرح دستیاب سرمایہ ادارے کے استحکام اور توسیع کے لیے استعمال ہوگا۔

۱- تیسرے سال کے آخر پر منافع کا ۵۰٪ حصہ داروں میں تقسیم ہوگا اور ۵۰٪ ادارے کی توسیع اور استحکام میں لگایا جائے گا۔

اس کے بعد چوتھے سال میں ۶۰٪ پانچویں سال ۷۰٪ اور چھٹے سال ۸۰٪ منافع حصہ داروں میں تقسیم ہوگا۔ اس کے بعد ہر سال ۸۰٪ منافع حصہ داروں میں اور ۲۰٪ ادارے کے استحکام اور توسیع میں استعمال ہوگا۔

۳- جو تعلیمی ادارے سیرت پبلی کیشنز کے پانچ حصص کے مالک ہوں گے انہیں ادارے کی درسی کتب ۳۰٪ رعایت پر ملیں گی۔ دیگر تمام شیئر ہولڈر اداروں کو سیرت پبلی کیشنز کی کتابیں ۲۰٪ رعایت پر ملیں گی۔

۴- ادارے کے شیئر ہولڈر سکولوں/کالجوں کے اساتذہ کی فری ٹریننگ صفاء ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ (سیرت) کے ذمہ ہوگی نیز ایسے تعلیمی اداروں کے لیے فری انتظامی مشاورت اور تربیت طلبہ کا پیکج بھی میسر ہوگا۔

۵- اگر کوئی شیئر ہولڈر اپنا فراہم کردہ سرمایہ واپس لینا چاہے تو پانچ سال کے بعد ایسا ممکن ہوگا۔

☆ ان شاء اللہ ہمارا مجوزہ ادارہ کامیاب ہوگا اور تعلیم و تدریس کے میدان میں ہمارے نظریاتی اہداف پورے ہوں گے۔

☆ ہمارا مستقبل قریب کا منصوبہ یہ ہے کہ آغا خان ایجوکیشن بورڈ کی طرز پر پرائیویٹ سیکٹر میں ایجوکیشن بورڈ حکومت سے منظور کرائیں گے اور اس کے بعد صفا یونیورسٹی ہمارا حتمی ہدف ہے جس کے لیے ایک ہزار کنال زمین کا قطعہ صفا ٹرسٹ کے لیے پہلے سے موجود ہے۔ اس طرح سکول سے لے کر یونیورسٹی تک بشمول امتحانات کا ہمارا اپنا ایک نظام ہوگا جو حکومت سے بھی منظور شدہ ہوگا۔

☆ اس ادارے کے باقاعدہ اکاؤنٹس رکھے جائیں گے جن کا سالانہ آڈٹ ہوگا اور بالکل شفاف طریقے سے ادارے کی تمام سرگرمیاں اور آڈٹ رپورٹس حصہ داروں کے لیے کھلی ہوں گی۔

☆ درسی کتب کی تیاری اور تربیت اساتذہ کے انتظامی سربراہ کے طور پر پروفیسر ملک محمد حسین صاحب (سابق بانی سربراہ 'آفاق' و ڈائریکٹر جنرل حراء سکولز و انچارج قومی تعلیمی پالیسی تنظیم اساتذہ پاکستان) کی خدمات ہمیں میسر ہیں۔ موصوف کو نصابات، درسی کتب اور تربیت اساتذہ کا وسیع تجربہ حاصل ہے اور اس شعبے میں چوٹی کے ماہر تعلیم کی حیثیت سے آپ کا نام معروف ہے۔

☆ اس اسلامی قومی منصوبے میں شراکت کے لیے دلچسپی رکھنے والے افراد اور ادارے تحریک اصلاح تعلیم سے رابطہ کریں۔ سیرت پبلی کیشنز کے شیئرز کا حصول پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر ہوگا۔

☆ اس سرمایہ کاری کے لیے سارے قانونی تقاضے پورے کیے جائیں گے۔ یاد رہے کہ تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ انکم ٹیکس قانون کے تحت ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔


برائے تفصیلات

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین 0300-4354 673 ermpak@hotmail.com

پروفیسر ملک محمد حسین 0333-4404 260 malikmh786@yahoo.com

صَفَاء انسٹی ٹیوٹ

کیمپ آفس 389 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰ ermpak@hotmail.com